کتاب و سنت اور اسلافِ امت کی تعلیمات کا علمبردار

ماہنامہ

اشرف الجرائد حیدرآباد

Volume:16 Issue:10 October 2023

مدیر

مولانا محمد عبدالقوی

ادارہ اشرف العلوم ٹرسٹ حیدرآباد

www.iauth.in

اشرف الجرائد میں شامل تمام مضامین کی تمام جزئیات سے مدیر کا اتفاق ضروری نہیں

آئینۂ مضامین

اشرف الجرائد کی توسیع واشاعت میں حصہ لے کر اشاعتِ دین کا ثواب حاصل فرمائیں۔ ادارہ



درسِ قرآن

محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی محبت دین حق کی شرط اول ہے

از: مولانا عبدالقادر فرید قاسمی*

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِیْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ﰳاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَاۤ اَحَبَّ اِلَیْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِیْ سَبِیْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ﴿۲۴﴾ (سورۃ التوبہ)

ترجمہ: اے پیغمبر! (مسلمانوں سے) کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں اور تمہارا خاندان، اور وہ مال ودولت جو تم نے کمایا ہے اور وہ کاروبار جس کے مندا ہونے کا تمہیں اندیشہ ہے اور وہ رہائشی مکان جو تمہیں پسند ہیں، تمہیں اللہ اور اس کے رسول سے، اور اس کے راستے میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں، تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر فرمادے۔

توضیح: کہتے ہیں کہ جب کسی کو کسی سے قلبی لگاؤ اور محبت ہوتی ہے تو تین وجوہ کی بنیاد پر ہوتی ہے (۱) حسن و جمال (۲) لیاقت وکمال (۳) مال ونوال؛ انسان یا تو حسن و جمال کا دلدادہ ہوتا ہے یا لیاقت وکمال سے متاثر ہوتا ہے یا مال ونوال کا اسیر ہوتا ہے، بہت شاذ ونادر ایسا ہوتا ہے کہ یہ تینوں اسباب محبت کسی ایک میں جمع ہو جائیں اور اگر جمع ہو بھی جائیں تو بدرجہ اتم جمع نہیں ہوتے ہیں؛ مگر انسان بھی اتنا جذباتی واقع ہوا ہے کہ اس کی طبیعت ان تینوں میں سے کسی ایک کو بھی پالیتی ہے تو اس کے آگے اپنی کمزوری کا ثبوت دے بیٹھتی ہے اور اس کی شیدائی ہو جاتی ہے، نگاہ جستجو اور ذوق مطالعہ سے کام لیں تو کائنات میں ایک ایسی انمول، نایاب، بے نظیر، بعد از خدا بزرگ ہستی گزری ہے کہ جس کی ذات پر انوار میں یہ وجوہِ محبت نہ صرف اکمل، اتم موجود تھیں بلکہ مشاہدوعیاں تھیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حسن و جمال اس قدر متاثر کن تھا کہ کسی نے اس چہرۂ پر انوار کو بدر کامل سے زیادہ دلکش بتلایا، کسی نے اس وجہِ منوّر کی روشنی میں رات کی تاریکی کے اندر گُم شدہ سوئی کو تلاش کیا، کسی کو اس

* ذمہ دار ادارہ حسیب المدارس، گھٹکیسر

پُرو جیہ چہرہ میں سورج کی کرنوں جیسی چمک دمک نظر آتی کیوں نہ ہو جب کہ صدیقہ عائشہؓ نے آپ کے حسن و جمال کا تعارف یوں کروایا تھا کہ یوسف علیہ السلام کے حسن کو دیکھ کر مصر کی عورتوں نے اپنی انگلیاں کاٹ لیں تھیں اگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرۂ انور کا حسن دیکھ لے تیں تو اپنے دلوں کو کاٹ لے تیں، یہ وہ حسن و جمال تھا کہ آنکھیں دیکھتیں تو دیکھتی رہ جاتیں، اس چہرۂ انور میں وہ جاذبیت اور کشش تھی کہ اس میں دلوں کا قرار، آنکھوں کی ٹھنڈک، دماغ کا سکون تھا۔ جہاں تک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لیاقت و کمال، اخلاق و کردار کا معاملہ ہے کسی سیرت نگار کی نگارشات، کسی عاشق رسول کی عشق سے سرمست تحریریں، کسی جانثار کی جنبش قلم سے اپنے محبوب کی اداؤں کی منظر کشی ایک جانب، خود دشمنوں کی طرف سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کمالات، حسن اخلاق و کردار کا نہ صرف اقرار بلکہ علی رؤس الاشہاد گواہیاں اور مداح سرائیاں تھیں۔ الفضل ما شهدت به الأعداء

اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نوال واحسان کو دیکھیں تو روایات یوں کہتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سخاوت مسلسل تیز رفتار ہواؤں کی طرح جاری رہتی تھیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سخاوت کے لیے ایک تعبیر یہ بھی اہل قلم نے قلم بند کیا ہے کہ اگر کلمہ طیبہ میں،، لا،، نہ ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے کبھی،، لا،، ہی نہ نکلتا، ہر مانگنے والے کو بھی دیتے نہ مانگنے والوں کو بھی محسوس کر کے عنایت فرماتے تھے، ایسے بے شمار واقعات آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کمالات، اخلاق و کردار کے ہیں۔ جب نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جامع الجمال والکمال والنوال ہیں اور ہم سے زیادہ ہمارے خیر خواہ اور نفع کے طالب ہیں تو پھر ہم کو بھی اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سب سے زیادہ محبت ہونی چاہیے، یہ ہمارا عقلی، ایمانی تقاضا ہے اگر مومنین میں کامل الایمان بننا ہے تو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سب سے زیادہ محبت کرنا پڑے گا اسی میں کمال ایمان بھی ہے اور حلاوت ایمان بھی۔

مسلمان سے اگر نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت وصورت، اخلاق و کردار، وفائیں، ادائیں پردہ خفا میں ہوں تو اس کے دل میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت و محبت کامل طور پر پیدا نہیں ہوسکتی، جب وہ نبی کو پڑھے گا، سنے گا خود بخود محبت عشق میں تبدیل ہوتی جائے گی پھر وہ عشق اس کو طاعت کے لیے مجبور کرے گا کیونکہ محبت موقوف ہے معرفت پر اور طاعت و عمل کا دارومدار محبت حقیقی پر ہوتا ہے، لہذا ذات نبی، کمال نبی، اوصاف نبی کی معرفت کے لیے پیارے حبیب کا تذکرہ پڑھنا ہوگا یا سننا ہوگا۔

اللہ تعالیٰ مجھے اور پوری امت مسلمہ کو اس محسن انسانیت، شفیع اعظم، قرار قلب مومنین کے تذکرے کو حرز جاں بنانے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنتوں پر بشوق عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے آمین

محمد کی محبت دین حق کی شرط اول   اسی میں ہو اگر خامی تو سب کچھ نامکمل ہے۔

درسِ حدیث



امت کی فلاح یابی کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا درد وغم

از: مولانا مفتی محمد احمد علی قاسمی*

عَنْ أَبِی هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: إِنَّمَا مَثَلِي وَمَثَلُ النَّاسِ كَمَثَلِ رَجُلٍ اسْتَوْقَدَ نَارًا، فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ جَعَلَ الْفَرَاشُ وَهَذِهِ الدَّوَابُّ الَّتِي تَقَعُ فِي النَّارِ يَقَعْنَ فِيهَا، فَجَعَلَ يَنْزِعُهُنَّ وَيَغْلِبْنَهُ فَيَقْتَحِمْنَ فِيهَا، فَأَنَا آخُذُ بِحُجَزِكُمْ عَنِ النَّارِ، وَهُمْ يَقْتَحِمُونَ فِيهَا. (بخاری:6483)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میری مثال اس شخص کے مانند ہے جس نے آگ روشن کی، جب آگ نے چاروں طرف روشنی پھیلا دی تو پروانے اور دوسرے وہ حشرات الارض جو آگ میں گرتے ہیں آ آ کر گرنے لگے، آگ جلانے والے شخص نے انہیں روکنا شروع کیا لیکن وہ نہیں رُکتے بلکہ آگ روشن کرنے والے کی کوششوں پر غالب رہتے ہیں اور آگ میں گر پڑتے ہیں اسی طرح میں تمہاری کمریں پکڑ پکڑ کر آگ سے روک رہا ہوں تم ہو کہ نارِ دوزخ میں گرتے جا رہے ہو۔

تشریح: نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفات حسنہ و اخلاق عالیہ میں ایک نہایت ہی ممتاز وصف اور عالی خلق رؤوف ورحیم ہونا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہی وہ دو اسماء ہیں جس سے خود باری تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کی تعریف وتوصیف فرمائی، آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیاتِ طیبہ کا لمحہ لمحہ صفتِ رحمت کی خبر ہی نہیں بلکہ گواہی دیتا ہے، اپنی امت کی فلاح و بہبود کے لیے دن رات بے قرار و بے چین ہوتا اور اسی غم وفکر میں گھلتا دیکھ کر حق تعالیٰ کو یہ فرمانا پڑا: فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ﴿۶﴾ (سورۃ الکہف) یعنی آپ (اے پیغمبر) اگر لوگ قرآن کی اس بات پر ایمان نہ لائیں تو ایسا لگتا ہے جیسے افسوس کر کر کے ان کے پیچھے اپنی جان کو گھلا بیٹھو گے۔

* استاذ حدیث وفقہ، ادارہ ہذا

امت کے تئیں غم وحزن کی ادنیٰ مثال حدیث مذکور میں ہے، جس میں آپ ﷺ فرمارہے ہیں ایک آدمی نے اپنی کسی ضرورت کے لیے آگ روشن کی، (جیسے پہلے زمانے میں پکوان یا روشنی یا سردیوں میں گرمی حاصل کرنے کے لیے لوگ آگ جلاتے تھے) تو اس آگ میں پروانے پتنگے اور دیگر آگ میں جانے والے کیڑے مکوڑے گرنے لگے، اس شخص کو رحم آیا کہ یہ جاندار آگ میں گر گر کر کیوں جلیں، تو اس نے اپنی بھرپور کوشش کے ذریعے ان کو آگ میں گرنے سے روکنے لگا، لیکن اس کے روکنے کے باوجود وہ برابر آگ میں گرنے اور مرنے لگے، حضور پاک ﷺ فرمارہے ہیں کہ میری مثال بھی اسی شخص کی طرح ہے، میں اللہ تعالیٰ کے اوامر ونواہی کو بیان کر کر کے تمہیں قعرِ جہنم میں گرنے سے روک رہا ہوں، ہدایت وضلالت کی راہیں واضح کر رہا ہوں، مرضیات ربانی ومنہیات الٰہی کی تعلیم دے رہا ہوں، دنیا وآخرت کی فلاح وکامیابی کی طرف دعوت دے رہا ہوں، اس کے لیے دن رات میری محنتیں اور قربانیاں ہیں، اور ایک تم ہو کہ مخالفت ونافرمانی کر کے میرے ہاتھ سے چھوٹے جارہے ہو، اور جیسے آگ میں گرنے والے پروانے ناواقفیت ولاعلمی کی وجہ سے اپنی تباہی وبربادی کو دعوت دے رہے ہیں اسی طرح تم عقل وشعور کی طاقت اور فہم وعلم کی قابلیت رکھنے کے باوجود دوزخ کی آگ میں گرنے، جلنے کے لیے تیار ہورہے ہو، یہ تو سراسر بذات خود بدخواہی اور بربادی کی علامت ہے۔

حضور اکرم ﷺ کی صفت رحمت ومؤدت کے حوالے سے کسی بھی مسلمان سے پوچھا جائے تو اس کے دل کی آواز یہی ہوتی ہے کہ ہمارے نبی ﷺ سراپا مجسمِ رحمت تھے، اسی رحمت ومحبت کی وجہ سے نبی ﷺ اپنی امت کو راہ ہدایت پر چلتے رہنے کی تعلیم دے رہے ہیں؛ لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ سب کچھ تسلیم کر لینے کے باوجود اطاعت وعمل کے وقت ہمت ہار بیٹھتے ہیں، راہِ حق وہدایت پر چلنے سے کتراتے ہیں، ان کی ''سنت وسیرت'' کو ''اسوہ اور نمونہ'' بنانے سے اعراض کرتے ہیں۔

ہمیں چاہیے کہ اس دوغلے پن اور منافقانہ طرزِ عمل سے باز آئیں، ساری دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونک سکتے ہیں، پر خدائے علیم وخبیر کی نگاہ محیط سے ایک لمحہ بھی پوشیدہ نہیں رہ سکتے، لہٰذا حدیث مذکور کا مدعا اور مقتضیٰ یہی ہے کہ آقائے رحمت ﷺ کے دین رحمت اور اسوۂ حسنہ کو اختیار کرلیں، اور اسی پر جینے اور مرنے کا عزم مصمم کرلیں، یہی محبت الٰہی اور عشق رسول ﷺ کا تقاضا ہے اور دنیا وآخرت کی کامیابی کا ضامن ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے نبی رحمت ﷺ کی سچی محبت عطا فرمائے۔ آمین

پیش گفتار

خطباء ودعاۃ اسلام کی توجہ کے لیے!

از: مدیر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ وبہ نستعین

جن علماء کرام کو اللہ تعالیٰ نے لکھنے بولنے کا سلیقہ عطا فرمایا ہے اور عوام الناس ان کی دعوت وتبلیغ سے مستفید ہورہے ہیں ان کی خدمت میں اپنے تجربات کی روشنی میں چند باتیں عرض کرنے کو جی چاہتا ہے، اگر اہل علم کو ان باتوں میں کچھ واقعیت محسوس ہو تو اس طرف توجہ فرمائیں اور اگر علمی اعتبار سے کچھ خلجان ہو تو راقم عاجز و آثم کی کوتاہیٔ علم پر محمول کرکے مطلع بھی فرمادیں تاکہ میں خود اپنی فکر ونظر کی اصلاح کرسکوں، امام عبدالوہاب شعرانیؒ کی یہ بات بہت جی کو لگتی ہے کہ ’’اپنے بڑوں کی بھی کوئی بات کھٹکے تو ادب سے ظاہر کردو، اس سے یا تو ان کا عمل درست ہوجائے گا یا تمہارا علم صحیح ہوجائے گا‘‘۔ بزرگوں کی کچھ ایسی ہی باتیں ہیں جن کی وجہ سے اپنی تہی دامنیٔ علم وعمل کے باوجود جو سمجھ میں آتا ہے اہل علم تک پہنچا دینے کی جرأت کرلیتا ہوں، ورنہ اپنے پاس اہل حق کی محبت کے علاوہ کوئی قابل ذکر چیز نہیں ہے۔

وہ بات یہ ہے کہ میں اپنے طویل دعوتی تجربے سے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ علماء کرام نے بعض مجبوریوں کی وجہ سے دین کے تمام شعبوں اور عنوانوں پر بولنا چھوڑ دیا ہے، چند گنے چنے عنوانات ہیں انہی پر کہا سُنا جاتا ہے، لکھا تو پھر بھی بہت کچھ جاتا ہے لیکن عوام کو سب کھول کر بتایا نہیں جاتا۔ پچیس تیس سال پہلے کی عوام اعتقادات کا جو شعور رکھتی اور جامعیت دین کے بارے میں جتنا کچھ جانتی تھی آج اس کا عشر عشیر بھی نہیں جانتی بلکہ اس کے برعکس خیالات رکھتی ہے، اس کی ایک وجہ تو عوام کا اردو اچھی طرح نہ جاننا اور علماء کا عوامی زبان سے متوحش اور متبعّد رہنا ہے۔ دوسری اہم وجہ دعوت وخطابت کا روزی سے جڑا ہوا ہونا، منبر ومحراب کا جاہل و

متعصب لوگوں کے ماتحت ہو جاتا ہے، روزی روٹی کے متاثر ہو جانے کا ڈر آدمی کی اظہار حق کی جرأت سلب کر لیتا ہے، اور مصلحت کے نام پر مداہنت کا خوگر بنا دیتا ہے، میرے خیال میں یہ مسئلہ اس دور کا بڑا اہم مسئلہ ہے، اس لیے میں ضرورت محسوس کرتا ہوں کہ ہر علاقے میں علماء کرام کسی سینیئر عالم ربانی کی سرپرستی میں اپنی ایک جمعیت متحدہ بنا کر کے اپنی زبانوں کو عوام کی گرفت سے آزاد کرا لیں اور مغلوبیت و مرعوبیت سے نجات پا جائیں، یہ طے کر لیں کہ کسی کو پسند آئے یا نہ پسند حق کو کھلے عام بیان کریں گے، دین کے ہر عنوان پر بولیں گے، عوامی غلط فہمیاں دور کریں گے، اور اللہ کے علاوہ کسی سے نہیں ڈریں گے **لا یخافون في الله لومة لائم** کے مصداق بن کر رہیں گے، یہ بات اپنی جگہ صحیح اور ضروری ہے کہ عنوان اور انداز قابل فہم ولائق تحمل ہونا چاہیئے۔

آپ کو خیال ہو رہا ہوگا کہ یہ کام تو علماء الحمدللہ کر ہی رہے ہیں اور بے خوف وخطر کر رہے ہیں، جی ہاں! میں بھی جانتا ہوں اور دیکھ رہا ہوں لیکن یہ سب جرأت وہمت اہل باطل کے خلاف محاذوں پر نظر آ رہی ہے، گمراہوں اور بددینوں کے مقابلے میں دکھائی دے رہی ہے، ہونا بھی چاہیے لیکن میرا دُکھڑا یہ ہے کہ اپنوں اور دین کے دعویداروں میں پائے جا رہے منکرات، غلط فہمیاں اور بداعتقادیاں کیوں نظرانداز کی جا رہی ہیں؟ کیا نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ اہل ایمان کی فکری وعملی کجی کو برداشت کر لیتے تھے؟ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ وہ حضرات بے راہ روی اور منکر شرعی تو بڑی بات معمولی سنتوں سے انحراف پر بھی نکیر کو اپنا فریضہ سمجھتے تھے؟ مسلم سلاطین اور خلفاء وامراء کو تک نہیں بخشتے تھے؟ کیا یہ نہیں فرماتے تھے کہ گردن پر رکھی تلوار کے نیچے بھی اگر احقاقِ حق کر سکوں تو کرے بغیر نہ مروں گا؟ کیا وہ غلطیاں کرنے والے بحیثیت مجموعی اچھے مسلمان نہیں تھے اور ان کے کاموں میں خیر غالب نہ تھا؟ احقاق حق، فکری بے راہ رویوں پر تنبیہ اور عامۂ مسلمین کو اعتقادی وعملی غلطیوں پر توجہ دلاتے رہنا ان کی مخالفت وعداوت ہے یا فریضہ اسلامی اور تقاضۂ بھائی چارگی ہے؟

داعئ کبیر حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمہ اللہ کی دلی آرزو یہ تھی کہ میری اس محنت وتدبیر کے ذریعہ پوری امت **جمیع و ماجاء به النبی** ﷺ پر آ جائے، اور ابتدائی دور میں اُنہیں اس میں بڑی کامیابیاں بھی ملیں کیونکہ سینیئر تجربہ کار اور مؤقر علماء کام میں شریک تھے، اِدھر کارکنان کو اپنے جہل اور علماء کی وقعت ورفعت کا اندازہ بھی تھا، (اگرچہ اس کے برعکس احوال بھی اس دور کے تاریخی شواہد بن چکے ہیں **من شاء فلیحقق**) لیکن مرورِ زمانہ کے ساتھ کام اکابر علماء کی گرفت سے نکل کر ایسے مقامی امراء کے ہاتھوں میں چلا گیا جو اس کام کے حق میں تو مخلص ومتفکر تھے مگر **جمیع ماجاء به النبی** کی جیم بھی نہیں جانتے تھے، جب بھی اکابر علماء نے ''یہ کام'' کہا تو اگرچہ ان کی ذہن میں **جمیع ماجاء به النبی** کا احیاء واستحکام ہوتا تھا مگر اِن لوگوں نے یہی سمجھا کہ ''اس کام''

سے مراد وہ تدبیر اور سبب وشکل ہے جو احیائے دین کے لئے مفید تو کہی جا سکتی ہے مگر مطلوب ومقصود ہر گز نہیں۔

اسی لیے ان بھلے مانسوں کی زبان سے اللہ کے گھروں میں بیٹھ کر یہ سفید جھوٹ بلا تکلف نکل رہا ہے کہ نمازوں کا چھوڑ دینا اتنا بڑا گناہ نہیں جتنا بڑا گناہ ''اس کام'' کو چھوڑنا ہے۔ ''اس کام'' سے کہنے والے کی مراد مطلق تبلیغ ہوتی، تب بھی یہ بات خلاف واقعہ تھی، چہ جائے کہ قائل ''اس کام'' کا مدلول مخلوق کے بنائے ہوئے ایک معاونِ تبلیغ نظام ہی کو سمجھتا ہے۔

یہ میں نے صرف ایک معروف ومشہور مثال دی ہے ورنہ اس طبقے کی طرف سے بر سرِ عام اور بیوتُ اللہ کے بیچ میں بیٹھ کر بہ بانگ دہل کہی جانے والی کذبات وخرافات کی حد نہیں ہے، علماء ایسی باتوں کو سن کر چونکتے ہیں حیرت کرتے ہیں دوسروں کے سامنے لطیفے بنا کر سناتے اور مذاق اڑاتے ہیں لیکن ان کے سامنے اسی وقت ٹوک کر یا تنہائی میں سمجھا کر تبوأ مقعد في النار سے بچانے کو اپنا فریضہ نہیں سمجھتے، کھل کر لکھنا نہیں چاہتے، پرائی جماعتوں کی بال کی کھال بھی نکال لیں گے لیکن اپنی یہ مرفوع القلم اور معصوم النکیر جماعت چونکہ بڑوں کا کام غالب الخیر کام اور مفید الانام والعوام خدمت کر رہی ہے اس لیے اس سے سب کچھ سُن لیا، سہہ لیا اور ہضم کر لیا جا رہا ہے، میں اہل علم سے جاننا چاہتا ہوں کہ اصلاح فکر وعمل کے زیادہ مستحق وہ اپنے ہیں (جن کو تمام علمائے دیوبند اہل حق قرار دے کر ہر طرح کی حمایت کرتے ہیں) یا وہ پرائے زیادہ مستحق ہیں (جن کو ہم نے اہل حق سے منحرف کہہ کر علیحدہ کر دیا ہے) ظاہر ہے کہ اپنوں کو بھٹکنے سے بچانا دوسروں کو سیدھی راہ دکھانے سے یقیناً زیادہ ضروری ہے، پھر یہ سکوت وتحمل کیوں؟ کیوں کھل کر غلطیوں کو غلطی نہیں بتایا جا رہا ہے، اسی لیے نا کہ وہ اس کو مخالفت سمجھ بیٹھیں گے اور غلط تاثر لیں گے، یا علماء کی نکیر کچھ لوگوں کے کام چھوڑ دینے یا اس کام میں اور نہ لگنے کا سبب ہوگا جس سے ہم گویا مناع للخیر بن جائیں گے؟ کیا یہی بات ہے؟ جی نہیں! اس سطحی خیال کا تو میں اپنے علماء سے تصور بھی نہیں کر سکتا مگر حسن تاویل کے لیے جواب سوچتا ہوں تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ جو جماعتِ علماء پوری دنیا میں احقاقِ حق اور ابطالِ باطل میں اپنا اس قدر امتیاز رکھتی ہے کہ دشمنانِ دین کی آنکھوں کی کھٹک اور حلق کا کانٹا کہلاتی ہے وہ ان مزعومات وتفردات بلکہ موضوعات ومخترعات پر مہر سکوت کیوں نہیں توڑتی؟

مجھے کوئی دعویٰ علم نہیں ہے محض اعترافِ جہل کی وجہ سے جاننا چاہتا ہوں کہ دنیا بھر کی تمام مساجد میں بیٹھ کر علی الاعلان کہی جانے والی ان خلاف حقیقت باتوں پر علی الاعلان نکیر کیوں نہیں ہونی چاہیے؟ کیوں اکثر علماء اور کاموں کی طرح یہ کام نہیں کرتے؟ کیوں ایک آدھ مرتبہ اختلاف کر کے سکوت وجمود کو مناسب سمجھ لیا جاتا ہے؟ جبکہ لاکھوں سے متجاوز لوگ ان بے سند اور غلط باتوں کو اعتقاد کے درجے میں پورے خلوص وللّٰہیت کے ساتھ اپنا

دین وعقیدہ بناتے چلے جا رہے ہیں؟ کوئی مجھے شرعی دلائل اور اکابر کے معقول نظائر سے مطمئن کر دے تو میں نہ صرف قبول کرنے بلکہ انہی صفحات پر رجوع کرنے کے لیے بھی تیار ہوں! بس میں اپنی قلت علم وفہم سے سمجھ نہیں پا رہا ہوں اور امت کے ایک بڑے طبقے کے حق میں مضطرب و بے چین ہوں، میں عملی طور پر روسیاہ و تہی دامن ہوں تبلیغی بھائیوں کے صوم وصلوٰۃ اور ایثار وقربانی سے بلاشبہ سبق سیکھتا رہتا ہوں، کبھی ان کو حقیر نہیں سمجھتا، اپنے ہی جسم کا خون سمجھتا ہوں اور انشاء اللہ علیم وخبیر کے سامنے اس قول میں جھوٹا نہیں نکلوں گا، مگر میں سوچتا ہوں کہ ہوش وحواس کی موجودگی میں اپنے خون کا سڑنا وخراب ہونا کیسے گوارا کرلوں؟ میں اپنی معلومات اور تجربات کی روشنی میں دین کے نام پر بڑھتے بے سند اور برخود غلط باتوں کے سلسلے اور اس پر بقدر ضرورت وبرملا نکیر نہ ہونے کے انجام سے امت کے حق میں خوفزدہ ہوں، اس طبقے میں خود احتسابی گویا ممنوع ہو چکی ہے دوسرا بھی نہیں بتاتا تو آخر اِن بے چارے مخلص طالبانِ دین کو پتہ کیسے چلے؟ اکابر علماء سے تو میں یہ حسن ظن کر سکتا ہوں کہ وہ اپنے دائرۂ عمل میں محدود ہو جانے کی وجہ سے عوامی سطح پر درپیش ان خطرات کو دیکھ نہیں پا رہے ہوں یا زیادہ اہم نہ سمجھتے ہوں، مفتیان کرام کا کام جو پوچھا جائے تو بس اس کا جواب دے دینا ہے ان کو یہی سمجھایا گیا ہے لیکن عوام الناس میں موجود دُعاۃ وخطباء اور خود دعوت وتبلیغ میں لگے علماء وفضلاء تو اپنی آنکھوں سے دیکھ اور کانوں سے سن رہے ہیں؟ کیا وہ ان باتوں پر فوری نکیر اور صاف صاف تردید نہیں کر سکتے؟ اور کیا یہ مسلمانوں کی دل داری کی خاطر اسلام کا نقصان گوارا کر لینا نہیں ہے؟ حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ’’اسلام میں دل شکنی بہت بڑا گناہ ہے مگر دین شکنی کے مقابل آ جائے تو پھر اسی کو اختیار کر لینا پڑے گا۔

ایک مہینے کے اندر کے صرف دو واقعات صورتحال کو سمجھنے کے لیے نقل کرتا ہوں، ایک قصبے میں چند فکرمندوں کو خیال ہوا کہ بچوں کو ’’سیرت کوئز‘‘ یاد کرا کے انہیں انعامات دیے جائیں تا کہ انہیں نبی کی معرفت و محبت نصیب ہو اس سلسلے میں چوں کہ مقامی دعوت کی ذمہ داروں کو اعتماد میں لینا ضروری تھا تو مشورے میں بات رکھی گئی۔ اس پر ایک ذمہ دار ساتھی پوچھتے ہیں کہ پہلے یہ بتاؤ کہ سیرت تبلیغ (مروجہ) کا حصہ ہے؟ یعنی اگر مروجہ تبلیغ کے کاموں میں شامل نہیں ہے تو نہیں ہونا چاہیے، ظاہر ہے کہ اس سوال کا سبب جہلِ محض اور غلو فی الدین نہیں تو اور کیا ہے؟ خیر یہ تو ایک جاہل کی حمیتِ جاہلیہ کی مثال تھی؟

ایک مایۂ ناز و متبحر عالم دین کو تبلیغی جوڑ میں بلایا گیا جس میں علماء وعوام کی بڑی تعداد شریک تھی تو انہوں نے یہ نادر تحقیق پیش کی کہ دس سال درس قرآن میں بیٹھنے والے کے چہرے پر داڑھی نہیں دیکھی مگر ایک چلے میں جا کر بے شمار لوگ داڑھیاں رکھ لیتے ہیں، نیز مدارس کا رائج نظام منہج نبوت کے خلاف ہے، دعوت کا یہ مروجہ نظام

ہی منہج نبوت ہے، وغیر ذالک من التعصبات

آخراس تقابل کی ضرورت ہی کیا ہے؟ جبکہ جو کچھ آپ کی صلاحیت وقابلیت ہے وہ انہی غیر مسنون مدارس کی یہ دولت ہے، حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ”اپنے اپنے کام میں یکسوئی سے لگے رہو مگر دین کے کاموں میں تقابل اور تفاضل مت کرو“۔ یہ تقابل وتفاضل ہی تحاسد وتباغض کی بنا ہے، تقابل وتفاضل کی اسی فضول اور مہلک مصروفیت کو دیکھ کر سید الطائفہ حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ نے چاروں سلسلوں میں باقاعدہ سلوک طے کر کے اجازت حاصل کی اور اپنے طبقے کو سلاسلِ اربعہ میں بیعت کر کے مشائخِ سلاسل کے درمیان تقابل وتفاضل کا فتنہ فرو کیا۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء

خلاصہ یہ کہ میرے ناقص علم وتجربے میں دن بہ دن عالمی اعتبار سے بڑھتے ان مبالغات تفردات اور موضوعات کو علماء کرام سنجیدگی سے نہیں لیں گے اور دین کی اس کھیتی سے خودرَو گھاس نکال نہیں پھینکیں گے اور نامعلوم وغیر واضح مصالح کے پردے میں چھپا کر پلتے رہنے دیں گے تو بہت پچھتائیں گے اور مستقبل کی طائفۂ منصورہ ان کے دامنِ تقدس سے اس داغ کو مٹا نہیں پائے گی، آخر ہمیں خطرہ ایک اچھے مفید اور عالمی دعوت کے متاثر ہو جانے کے علاوہ اور کیا ہے؟ جبکہ خوبیوں کی بھرپور تائید وحمایت کے ساتھ خرابیوں کی پرخلوص تنبیہ سے یہ کام مزید پروان چڑھے گا، مضبوط ومستند ہوگا، اور پھیلے گا، ساتھ ہی عند اللہ مردود ہونے سے بچ جائے گا، اور علماء کرام اپنے فریضۂ منصبی سے فارغ اور عند اللہ مسؤلیت سے محفوظ ہوتے چلے جائیں گے۔

ظاہر ہے کہ یہ کامیابی نجی تبصروں اور بے جا تذکروں یا وقتی فتووں سے حاصل نہیں ہوگی غلطی پر برابر نکیر کرنے اور ہر عالم کے کرنے سے حاصل ہوسکے گی ورنہ اسی کام کے حق ہونے اور اسی میں نجات وکامیابی کے منحصر ہونے کے ایسے گیت سنائے جارہے ہیں اور ایسا نشہ چڑھایا جارہا ہے کہ معمولی وقت لگایا ہوا بھی بڑے بڑے علماء کو دین کا کام نہ کرنے کا مجرم قرار دیتے ہوئے باک نہیں محسوس کررہا ہے یہ اکثریت کا حال ہے۔

تمہیدی بات شاید زیادہ طویل ہوگئی اور شاید پیش گفتار کے قارئین میری ان تلخیوں کے عادی وبے زار بھی ہو چکے ہوں گے، راقم ہی کو متعصب وکم نگاہ قرار دے لیتے ہوں گے لیکن کیا کروں خود کچھ نہ ہونے کے باوجود جن اکابر کی جوتیوں میں رہنے اور دین کی حقیقت کو ان کی باتوں میں سمجھنے کا موقع مل سکا وہ کچھ یہی ہے کہ آدمی کتنا ہی بے عمل سہی، فکر ونظر درست اور عقیدہ وایمان سلامت رہنا بہت ضروری ہے، پھر اعمال صالحہ اور ورع وتقویٰ بھی میسر ہو جائے تو کیا ہی کہنے؟ نور علی نور اور سرور علی سرور ہے۔

اس تمہید کے بعد عرض ہے کہ ان دِنوں مسلمانوں کے سماج میں ایک دینی ضرورت سے کیے گئے طویل سفر

اورعوام وخواص سے ملاقاتوں کے بعد اندازہ ہوا کہ تین پہلو سے عوام وخواص کی رہنمائی بہت ضروری ہے۔

۱۔ دین کیا ہے؟ بے دینی کیا ہے؟۔ ۲۔ دیندار کون ہیں؟ دنیادار کون ہیں؟۔ ۳۔ ہر کام خدا سے ہونے اور غیرِ خدا سے کچھ نہ ہونے کا صحیح مفہوم کیا ہے؟۔

فی الحال عوام وخواص میں تقریباً سبھی لوگ چند مخصوص سنتوں اور صوم وصلوٰۃ کی پابندی اور اپنے اپنے منتخب کردہ جماعتوں سے وابستگی کو دین اور ان کاموں اور ان سنتوں کے علاوہ بقیہ امور دین کو دین سے خارج ہی سمجھ رہے ہیں، سماجی ورفاہی خدمات کو بھی دین نہیں مانتے، سیاسی وملی ضروریات کی فکر کو بھی دین سے خارج قرار دیتے ہیں، یا زیادہ سے زیادہ دوسرے درجے کا کام سمجھتے ہیں اسی طرح دیندار اس کو سمجھا جاتا ہے جس کا حلیہ مسنون ہو خواہ کیسی ہی خطرناک بے دینیوں میں، کسب حرام میں، اہل وعیال پر مظالم میں، میراث اور دیگر معاملات کے غصب میں، بے پردگی وغیرہ کبائر میں مبتلا کیوں نہ ہو؟ اس کے مقابل جو غیر مسنون حلیہ ولباس میں مبتلا ہے وہ شخص دنیادار کہلاتا ہے، چاہے فرائض کا پابند، محرمات سے مجتنب، اور خوفِ خدا وحُبِّ رسول سے سرشار ہی کیوں نہ ہو؟

اسی طرح ''خدا سے ہونے کا یقین'' کا مفہوم دین داروں کے ذہنوں میں ترک تدبیر اور قدرتِ نفس کا انکار ہے جس کی وجہ سے دین پسند طبقہ بے عملی اور کاہلی کو توکل قرار دے کر سیاسی بصیرت سے محروم حالاتِ زمانہ و علاقے سے نابلد اور اختیار اسباب ووسائل میں معاصر اقوام سے بہت پیچھے ہو گیا ہے؛ یہ صحیح ہے کہ ہوتا تو سب کچھ قدرتِ الٰہیہ کے ماتحت مگر قدرت خدا کا ظہور عادتاً قدرتِ نفس کے صدور کے بعد ہوتا ہے یعنی ہم اپنے حصے کا کام کرلیں اللہ تعالیٰ اپنا کام کرے گا، لیکن ہاتھ پہ ہاتھ دھرے آسمانی قدرت کے منتظروں کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ علماء کرام مختلف مواقع سے مختلف تعبیرات سے مختلف امثلہ کے ذریعے مسلمانوں میں سے ان تینوں غلط فہمیوں کو دور کریں، اس کے واقعی پہلو کی اہمیت اُجاگر کرتے ہوئے اس کے غلط تصور کو دور کریں، کیونکہ یہ بظاہر عام سی بات ہے مگر ان کے انجام بہت ہی خطرناک ہیں، آج سماج کے بہت سے نقصانات اور فسادات کا سبب غور کرنے سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ دین کے صحیح تصور سے محروم ہونا ہے، جب علماء اپنا کام نہیں کریں گے اور ہر پہلو سے قوم کی شرعی رہنمائی کی طرف توجہ نہیں دیں گے، تو جہلاء دین کی تشریح کی زمام اپنے ہاتھ میں لے کر دین کی شبیہ ہی بدل ڈالیں گے اور اب ایسا ہو رہا ہے، علماءِ دیوبند تائید الٰہی سے دین کی صحیح اور متوارث تعبیرات میں نمایاں مقام رکھتے ہیں، لیکن اس کی تشہیر وتبلیغ میں ان کا دائرہ دعوت بہت

محدود ہوتا جا رہا ہے کیونکہ گزشتہ سو سال میں لفظ تبلیغ کا جو استعمال ہوتا رہا ہے وہ پورے دین کی دعوت کو محیط ہونے کے بجائے ایک مخصوص کام کے لیے محدود ہو گیا ہے، اب عوام تو عوام علماء کا ذہن لفظ تبلیغ کو سن کر ایک مخصوص کام کی طرف چلا جاتا ہے حالانکہ کم از کم علماء کرام تو **بلغ ما انزل الیک من ربک** کے تحت لفظِ تبلیغ کو تمام دین منزل من اللہ کے لیے علماً و عملاً عام رکھیں، کسی خاص دعوت کے لیے مخصوص نہ کر دیں، یہ حقیقت ہے کہ چھوٹی چھوٹی غفلتیں بڑے بڑے نقصان کا سبب بن جاتی ہیں چنگاری کو حقیر سمجھ کر چھوڑ دیا جائے تو پورا شہر خاکستر کر کے دکھا سکتی ہے۔

خدا تعالیٰ ہمیں اس کا احساس نصیب فرمائے اور علمائے امت کو دین کامل کا داعی بننے اور دین کو منکرات و مخترعات سے محفوظ رکھنے کے لیے مطلوب جرأت نصیب فرمائے۔ آمین

والسلام علی النبی الکریم

(بقیہ صفحہ: ۴۲ سے)

اور عدالت سے اس کے بائیکاٹ کا مطالبہ کریں، یہ دنیا دار الاسباب ہے، بظاہر کامیابی کے آثار موجود نہ ہوں پھر بھی ہم اسباب اختیار کرنے کے مکلف ہیں، باقی اسباب و مساعی کے مطابق نتائج برآمد کرنا اور ہماری کوششوں کو بامراد بنانا اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے۔

کیے جاؤ کچھ لے کر نام خدا
کچھ نہ کرنا بڑی خرابی ہے
کامیابی کچھ اور نہیں
کام کرنا ہی کامیابی ہے

گوشہ سیرت

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عتبہ کی فریاد

از: مرتب

حضرت جابر بن عبد اللہؓ فرماتے ہیں کہ ''ابوجہل اور جماعت قریش کا موضوع بحث یہ تھا کہ ''محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا مسئلہ ہمارے لئے دردِ سر بنا ہوا ہے، اگر کوئی سحر، کہانت اور شعروشاعری سے واقف کا رمل جائے تو وہ اُن سے بات کر کے مسئلے کی گتھی سلجھائے۔ عتبہ نے کہا کہ: مجھے ساحروں، کاہنوں، اور شاعروں کو خوب سُن نے کا موقع ملا ہے، مجھے ان تینوں چیزوں کا علم بھی ہے اگر وہ اِس قبیل سے ہے تو وہ مجھے معلوم ہو ہی جائے گا۔

چناں چہ عتبہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس چلا آیا، اور پوچھنے لگا کہ اے محمد! بتاؤ تم بھلائی پر ہو یا ہاشم؟ تم خیر پر ہو یا عبد المطلب؟ تم بہتر طریق پر ہو یا عبد اللہ؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر تم کیوں ہمارے معبودوں کو بُرا کہتے ہو؟ اور ہمارے آباء واجداد کو گمراہ بتلاتے ہو؟ اگر تمہیں سرداری چاہیے تو ہم سب تمہاری ماتحتی میں آجائیں گے، تم جب تک زندہ رہو ہمارے سردار بنے رہو، اگر تمہیں شادی کا تقاضہ ہے تو قریش کے کسی بھی گھرانے کی تمہاری پسند کے مطابق دس لڑکیاں تم سے بیاہ دیں گے؟ اور اگر تمہیں مال چاہیے تو ہم تمہارے لئے اتنا مال جمع کر دیں گے جو تمہارے اور تمہاری نسلوں کے لئے کام آجائے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاموش سنتے رہے کچھ نہیں فرمایا۔

جب وہ کہہ چکا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سورۂ حم سجدہ کی تلاوت شروع فرمائی، یہاں تک کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس آیت پر پہونچے فَإِنْ أَعْرَضُوا فَقُلْ أَنذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَثَمُودَ ﴿١٣﴾ عتبہ نے (قرآن پاک کی آیات سن کر) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو روک دیا اور عذاب سے بچنے کے لئے رحم کی فریاد کرنے لگا۔ پھر وہاں سے اُٹھ کر دوستوں سے بچتا ہوا چلتا بنا۔

ابوجہل نے اہل مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اے قریشیو! واللہ میرا خیال ہے کہ عتبہ اپنا دین چھوڑ کر بے دین ہو گیا، اور اُسے اُن کا کھانا پسند آ گیا، اور ضرور اُس نے کسی مصیبت ہی کی وجہ سے ایسا کیا ہوگا؟

آؤ ہم (حقیقت جاننے کے لئے) اُس کے پاس چلتے ہیں، سب لوگ عتبہ کے پاس چلے آئے، ابوجہل نے کہا: بہ خدا ہمارا خیال ہے کہ تم بے دین ہو چکے ہو اور اُن کی بات تمہیں بھا گئی ہے، اگر تمہیں کوئی حاجت تھی تو

ہم تمہارے لئے اتنا مال اکٹھا کر دیتے جس سے تمہیں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے کھانے کی ضرورت نہ پڑتی، عتبہ اس بات سے چراغ پا ہو گیا، کہا کہ: خدا کی قسم کہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کبھی بات نہیں کروں گا۔ اور تم جانتے ہو میں قریش کا بڑا مالدار ہوں، لیکن میں اُن کے پاس گیا۔۔۔۔

اور پھر اُن لوگوں کو ساری بات سنائی، اور کہا کہ: میری باتوں کا جس شئی (کلام) سے اُس نے جواب دیا ہے کہ وہ نہ تو جادوگری ہے، نہ شاعری اور نہ کہانت۔ اُس نے قرآن پڑھ کر سنایا اور جب وہ اس آیت پر پہونچا تو میں نے اس کو روک دیا اور رحم کی فریاد کی، کیوں کہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جب بھی کوئی بات کہی وہ جھوٹی نہیں نکلی، سو مجھے ڈر لگا کہ کہیں تم پر عذاب نہ آ جائے۔

اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ عتبہ نے اپنی قوم سے کہا: اے قریشیو! میری بات مانو اور میرا مشورہ سنو، اس آدمی کو اپنے حال پر چھوڑ دو، اور اس سے کنارہ کشی اختیار کرلو، بہ خدا جو بات میں نے اس سے سنی ہے وہ ضرور ہو کر رہے گی۔ اگر عرب اس پر غالب آ گئے تو تم ہی اس کے لئے کافی ہو جاؤ گے، اور اگر وہ عرب پر غالب آ جائے تو اس کی سلطنت تمہاری سلطنت ہوگی، اس کی عزت تمہاری عزت و وجاہت ہوگی اور تم ہی لوگ سب سے زیادہ سعید ہو گے۔

قوم نے جواب دیا: اے ابوالولید! تجھ پر اس کی زبان کا جادو چل گیا ہے۔

ابوالولید نے کہا: میرا تو یہی مشورہ ہے، اب تمہاری مرضی میں جو آئے کرو۔ پھر اس نے ایک شعر پڑھا، ابوطالب فرماتے ہیں کہ اس نے اس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف کی۔

(دلائل النبوۃ: ۲/۱۴۶-۱۴۷)

(بقیہ صفحہ: ۱۹ سے)

وفات: حضرت ام دحداح رضی اللہ عنہا کے مزید حالات دستیاب نہیں، تاریخ اور سیر کی کتابوں سے صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ حضرت ابوالدحداح رضی اللہ عنہ نے صلح حدیبیہ کے بعد وفات پائی تو اپنے پیچھے کوئی اولاد نہ چھوڑی، غالباً ام دحداح رضی اللہ عنہا کی وفات بھی انہیں کی حیات میں ہوئی، اسی لئے اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوالدحداح رضی اللہ عنہ کا ترکہ ان کے بھانجے حضرت ابولبابہ انصاری رضی اللہ عنہ کو عطا کیا۔ ''فدعا النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عاصم بن عدی: فقال: هل كان له فيكم نسب'' فقال: لا: فأعطى ميراثه ابن أخيه أبا لبابة بن عبد المنذر ''۔

(الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ: ابوالداحداح الانصاری: ۷/۱۰۱، دار الکتب العلمیۃ، بیروت)

گوشہ خواتین

اسلام کی باکمال خواتین

حضرت اُم دحداح رضی اللہ عنہا

(حضرت ابو دحداح رضی اللہ عنہ کی اہلیہ)

از: مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی*

نام ونسب: حضرت ام دحداح رضی اللہ عنہا مشہور صحابی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُبوالداح ثابت بن دحداح انصاری رضی اللہ عنہ (شہیدِ احد) کی اہلیہ اور زوجہ محترمہ ہیں، اور بڑی عظیم خاتون ہیں، ان میاں بیوی نے دین اسلام کے فروغ کے لئے اپنا سب کچھ قربان کردیا۔

قبول اسلام اور نکاح: ام دحداح رضی اللہ عنہا نے اسی وقت قبول اسلام کیا جس وقت حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ مدینہ کے سفیر اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قاصد بن کر تشریف لائے، اور لوگوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آمد سے قبل ہی مدینہ میں اسلام کی دعوت دینے لگے، اسی وقت ام دحداح رضی اللہ عنہا شرف اسلام سے مشرف ہوگئیں، پورے گھرانے نے اسلام قبول کرلیا۔

اخلاص وللّٰہیت اور جود وسخا: دونوں میاں بیوی نہایت سخی واقع ہوئے تھے، جوش ایمان اور اخلاص وللّٰہیت میں اپنی نظیر آپ تھے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب سورۃ الحدید کی آیت ''مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یُقۡرِضُ اللّٰہَ قَرۡضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗ وَلَہٗۤ اَجۡرٌ کَرِیۡمٌ (الحدید:۱۱) (کون ہے جو اللہ کو قرض دے ، اچھا قرض تا کہ اللہ اسے کئی گنا بڑھا کر واپس دے اور اس کے لئے بہترین اجر ہے) تو حضرت ابوالدحداح رضی اللہ عنہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: ''یا رسول اللہ! کیا اللہ تعالیٰ ہم سے قرض چاہتے ہیں؟'' نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ہاں! اے ابوالدحداح'' حضرت ابوالدحداح رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! ذرا اپنا دستِ مبارک مجھے دکھایئے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا دست مبارک ان کی طرف بڑھایا تو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دست مبارک اپنے ہاتھ میں لے کر کہا: یارسول اللہ! میں اپنا باغ اللہ کی راہ میں دیتا ہوں۔

---

* ادارہ علم وعرفان، حیدرآباد، واستاذ حدیث دارالعلوم دیودرگ

اس کے بعد انہوں نے اس باغ کو اللہ کی راہ میں صرف کر دیا، اس میں کھجور کے چھ سو درخت تھے، اسی میں ان کا گھر تھا، اور وہیں ان کی آل واولاد بھی سکونت پذیر تھی، حضور اکرم ﷺ سے یہ بات کہہ کر وہ سیدھے اپنے گھر آئے، اور اہلیہ محترمہ ''ام دحداح'' کو پکار کر کہا: دحداح کی ماں! باہر آجاؤ، میں نے یہ باغ اپنے رب کو بطور قرض دے دیا ہے۔

حضرت ام دحداح رضی اللہ عنہا نے کہا: ابوالدحداح رضی اللہ عنہ تم نے نہایت نفع بخش سودا کیا ہم نے، یہ کہہ کر اپنا ساز وسامان اور اپنے آل واولاد کو لے کر باغ سے باہر نکل آئے۔'' فقال: اخرجي يا ام الدحداح، فقد أقرضته الله عز وجل، فتصدق بحائط على الفقراء والمساكين''

(الاستيعاب فی معرفۃ الأصحاب: أبوالدحداح: ۴/۱۶۴۵، دار الجيل، بيروت)

اور ایک روایت میں یہ واقعہ کچھ اس طرح منقول ہے:

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا، یا رسول اللہ! میں اپنے مکان کی دیوار اٹھانا چاہتا ہوں، بیچ میں فلاں شخص کا کھجور کا درخت ہے، اگر آپ اس سے کہہ دیں کہ وہ یہ درخت مجھے دے دے تو میں اپنی دیوار کی ٹیک اس سے لگا کر دیوار کو بآسانی مکمل کر سکوں، آپ ﷺ نے اس آدمی سے کہا کہ تم اپنا وہ درخت اس کو دے دو، اس کے عوض اللہ تعالیٰ تمہیں جنت میں کھجور کا درخت عطا فرمائے گا، اس آدمی نے اپنا درخت دینے سے عذر کیا، حضرت ابوالدحداح رضی اللہ عنہ کو علم ہوا وہ اس شخص کے پاس گئے اور اس سے کہا کہ تم اپنا کھجور کا درخت مجھے دے دو، اور اس کے بدلے میں میرا کھجور کا باغ لے لو، اس نے یہ قبول کر لیا، اس کے بعد ابوالداحداح رضی اللہ عنہ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں پہنچے اور عرض گذار ہوئے یا رسول اللہ ﷺ! میں نے اس آدمی سے وہ کھجور کا درخت اپنے باغ کے بدلے میں خرید لیا ہے، یہ میں آپ کی نذر کرتا ہوں، آپ اس ضرورت مند کو دے دیجئے، اس کے بعد نبی کریم ﷺ نہایت فرحت وانبساط اور شادمانی کے ساتھ فرمایا: ابودحداح رضی اللہ عنہ کے لئے جنت میں کھجور کے کتنے بڑے اور بھاری خوشے ہیں، اس کے بعد حضرت ابودحداح رضی اللہ عنہ اپنی اہلیہ محترمہ کے پاس گئے اور ان سے کہا: اے ام دحداح رضی اللہ عنہا اس باغ سے نکل آؤ میں نے اس کو جنت کے کھجور کے عوض بیچ ڈالا ہے، بیوی نے کہا: یہ تو بڑا نفع کا سودا ہے۔ فقال: كم من عذق لأبي الدحداح في الجنة، قالها مرارا، قال: فأتى امرأته، فقال: يا ام الدحداح، اخرجي من الحائط، فإني قد بعته بنخلة في الجنة، فقالت: ربح البيع'' (الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ: ابوالداحداح الانصاری: ۷/۱۰۰، دار الکتب العلمیۃ، بیروت)

(بقیہ صفحہ: ۱۷ پر)

تذکارِ صحابہؓ

حضرت زید بن خطاب رضی اللہ عنہ

از: مولانا عبدالرشید طلحہ نعمانی قاسمی*

تاریخ اسلام کے سنہرے اوراق گواہ ہیں کہ ''السابقون الاولون'' کے مبارک لقب کے ساتھ ساتھ شہادت کا مقامِ بلند پاکر زندۂ جاوید رہنے والی نفوسِ قدسیہ میں ایک عظیم شخصیت سیدنا زید بن خطاب رضی اللہ عنہ کی ہے، جو جذبۂ جہاد سے معمور، سادگی و بے نفسی کا پیکر اور تقویٰ و پرہیزگاری کی صفت سے آراستہ تھے۔ آپؓ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے نہ صرف عمر میں بڑے تھے؛ بل کہ دین اسلام بھی پہلے قبول کیا تھا؛ اسی لیے علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ اپنے برادر بزرگوار کی شہادت کے بعد اظہارِ غم کے طور پر یوں کہا کرتے تھے: كان يقول أسلم قبلي و استشهد قبلي .میرے بھائی دونیکیوں میں مجھ سے سبقت لے گئے، مجھ سے پہلے اسلام لائے اور مجھ سے پہلے جام شہادت نوش کیا۔ (سیر اعلام النبلاء)

سوانحی نقوش:

آپؓ کا نام نامی: زید اور کنیت 'ابوعبدالرحمن' تھی، خاندانی تعلق قریش کے قبیلے 'بنوعدی' سے تھا۔ نویں پشت میں جا کر آپ کا نسب، رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبارک نسب سے جا ملتا ہے۔ آپ امیر المؤمنین سیدنا فاروق اعظمؓ کے باپ شریک بھائی تھے۔ والد کی جانب سے آپ کا سلسلۂ نسب اس طرح ہے، زید بن خطاب بن نفیل بن عبدالعزیٰ بن رباح بن عبداللہ بن قرط بن زراح بن عدی بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ قرشی عدوی۔ آپ کی والدہ کا نام 'اسماء بنت وہب' تھا جو بنواسد سے تھیں اور سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی والدہ کا نام 'حنتمہ' تھا، نانہالی سلسلہ نسب یہ ہے، اسماء بنت وہب بن حبیب اسدی۔ آپ سانولی رنگت اور طویل القامت شخصیت کے مالک تھے۔

حضرت زید بن خطاب رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے فطرتِ سعیدہ سے نوازا تھا۔ وہ ان عظیم المرتبت نفوس میں سے ہیں، جنھوں نے بعثتِ نبوی کے ابتدائی تین سالوں کے دوران دعوت حق پر لبیک کہا اور پھر سالہا سال تک مشرکین مکہ کے ہولناک مظالم کا ہدف بنے رہے۔

* استاذ شعبۂ عالمیت ادارہ ہذا

ہجرت مدینہ اور غزوات میں شرکت:

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کو مکہ معظّمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دی تو حضرت زید بن خطاب رضی اللہ عنہ مہاجرین کے پہلے قافلے کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ آ گئے۔ ایک دوسری روایت کے مطابق انہوں نے مہاجرین کے تیسرے قافلے کے ساتھ ہجرت کی اور قباء میں حضرت رفاعہ بن عبدالمنذر رضی اللہ عنہ کے ہاں قیام کیا۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی مدینہ میں فروکش ہوئے اور اس قدیم شہر کے درو دیوار طلعتِ اقدس سے جگمگانے لگے۔ ہجرت کے چھٹے مہینے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ (خادمِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے سوتیلے والد) کے مکان پر انصار و مہاجرین کو جمع کیا اور ان میں مواخاۃ قائم کی۔ حافظ ابنِ عبدالبر رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت زید بن خطاب رضی اللہ عنہ کو حضرت معن بن عدی عجلانی انصاری رضی اللہ عنہ کا دینی بھائی بنایا۔ (الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب)

آپ نے غزوۂ بدر سمیت تمام غزوات میں اپنی قوتِ بازو کے جوہر دکھائے۔ ہجرت کے تیسرے سال میدانِ اُحد میں چشم فلک نے دیکھا جب آپ زرہ سے بے نیاز ہو کر مشرکین کی صفوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ آپ کے برادرِ گرامی سیدنا عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے کہا: اے بھائی! میں تمہیں قسم دیتا ہوں کہ میری زِرَہ (یعنی لوہے کے جنگی لباس) کو پہن لو، حضرت زید رضی اللہ عنہ نے زرہ پہن لی پھر اسے اتار دیا، حضرت سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے پوچھا: اب کیا ہوا؟ عرض کیا: ”آپ اپنے لئے مرتبۂ شہادت پسند کرتے ہیں تو مجھے بھی رتبۂ شہادت پا لینے کا شوق ہے۔ زرہ وہ پہنے جس کو زندگی عزیز ہو، میں تو اپنی زندگی راہِ حق میں بیچ چکا ہوں۔“ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اپنے بھائی کا جذبہ شہادت دیکھ کر خاموش ہو گئے اور واپس اپنی صف میں آ گئے۔ اِدھر سیدنا زید بن خطاب رضی اللہ عنہ بغیر زرہ کے دشمنوں کی صفوں میں گھس گئے اور اِس جوش و وارفتگی سے لڑنے لگے کہ شجاعت بھی آفریں پکار اُٹھی۔

غزوۂ اُحد کے بعد صلح حدیبیہ کے موقع پر جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیعت لینا شروع کی تو آپ نے جان بازوں کی فہرست میں نام لکھایا۔ اس کے علاوہ خندق حنین اور اوطاس وغیرہ میں بھی برابر شریک رہے، اور سرفروشی کا حق ادا کیا۔ حجۃ الوداع میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمرکاب تھے۔ اسی موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فرمایا تھا کہ جو تم کھاتے پہنتے ہو وہی اپنے غلاموں کو بھی کھلاؤ پہناؤ۔ اور اگر وہ کسی جرم کے مرتکب ہوں اور تم نہ معاف کر سکو تو فروخت کر ڈالو۔

جنگ یمامہ میں شرکت وشہادت:

حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سریر آرائے خلافت ہوئے تو انھوں نے

منکرین زکوٰۃ کے خلاف جہاد کے لیے لشکرِ اسلام کا امیر مقرر کرنا چاہا تو حضرت زید رضی اللہ عنہ نے معذرت کرلی اور عرض کی: میں دورِ رسالت میں بھی شہادت کا متلاشی اور اُمیدوار تھا؛ لیکن شہادت سے سرفراز نہ ہوسکا اور اب بھی شہادت کا طلب گار ہوں، لہٰذا لشکر کا سپہ سالار نہیں بن سکتا؛ کیونکہ سپہ سالار کے لئے مناسِب نہیں ہوتا ہے کہ آگے بڑھ کر خود لڑے، اس لئے کہ اسے لشکر کی کمان سنبھالنی ہوتی ہے، البتہ جب 12 ہجری میں نبوت کے ایک جھوٹے دعویدار (طلیحہ بن خویلد جس نے بعد میں توبہ کرلی تھی) کے خلاف جنگ میں آپ لشکرِ اسلام کے اگلے حصے پر 200 سواروں کے نگران مقرر ہوئے۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں نبوت کے ایک اور جھوٹے دعویدار مسلیمہ کذاب کے خلاف اسلامی لشکر روانہ ہونے لگا تو سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے آپ کو الوداع کہا، اس معرکہ یمامہ میں آپ نے بہادری اور ہمت کا وہ پُرجوش مظاہرہ کیا جسے ہرگز فراموش نہیں کیا جاسکتا، اس جنگ میں لشکرِ اسلام کا جھنڈا آپ نے تھام رکھا تھا، جنگ زور وشور سے جاری تھی کہ اس دوران مسلیمہ کذاب کے ایک خاص آدمی رجال بن عنفوہ مرتد سے سامنا ہوا تو آپ نے ارشاد فرمایا: ''خدا کی قسم! تو دینِ اسلام کو چھوڑ کر کافر ہوچکا ہے؛ مگر میں تجھے دینِ اسلام کی دعوت دیتا ہوں کہ تیرے لئے اسی میں عزت وشرافت ہے اور تیرا مال ودولت بھی زیادہ ہوجائے گا مگر اس بدبخت نے اسلام قبول کرنے سے انکار کردیا بالآخر اس کی موت آپ کے ہاتھوں ہوئی۔''

یہ جنگ امیر المؤمنین سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں 12 ہجری ماہِ ربیع الاوّل میں ہوئی، جس میں 1200 مسلمان شہادت سے سرفراز ہوئے جن میں 700 حافظ وقاری صحابہ رضی اللہ عنہم بھی تھے۔ جنگ یمامہ میں مسلمانوں کی فتح سے فتنۂ ارتداد کا بڑی حد تک خاتمہ ہوگیا، اِس فتنۂ عظیم کے استیصال کے لیے سیدنا زید بن خطاب رضی اللہ عنہ اور اِن جیسے دوسرے جان باز اصحاب رضی اللہ عنہم نے جس ہمت، شجاعت اور استقامت کا مظاہرہ کیا وہ بلاشبہ تاریخ اسلام کا ایک تابناک باب ہے۔

برادرِ مکرم کے فراق میں:

سیّدنا زید رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر سن کر سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ پر رِقت طاری ہوگئی تھی اور فرمایا: ''اللہ پاک میرے بھائی پر رحم کرے! صدمہ اتنا شدید تھا کہ کسی صورت بھلائے نہ بھولتا تھا۔ ابن اثیر رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: ''بادِ صبا چلتی ہے تو مجھے اس سے زید رضی اللہ عنہ کی خوشبو آتی ہے اور ان کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔''

امام حاکم رحمہ اللہ نے اپنی مستدرک میں لکھا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو جب کبھی کوئی مصیبت پیش آتی تو فرماتے: ''سب سے بڑی مصیبت زید رضی اللہ عنہ کی جدائی تھی، اس کو برداشت کیا اور صبر کیا، اب اس سے بڑھ کر کیا مصیبت ہوسکتی ہے؟''

حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت میں ایک مرتبہ عرب کا نامور شاعر مُتَمِّم بن نویرہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ متمم کے بھائی مالک بن نویرہ کو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہدِ خلافت میں حضرت خالد بن ولیدؓ نے غلط فہمی کی بناء پر قتل کر ڈالا تھا، اس واقعہ نے اس کو اس قدر صدمہ پہنچایا کہ ہمیشہ اپنے محبوب بھائی کے غم میں رویا کرتا اور مرثیے کہا کرتا تھا، جہاں کہیں جاتا لوگ اس کے گرد جمع ہو جاتے اور اس سے مرثیے پڑھوا کر سنتے۔ وہ مرثیہ پڑھتے ہوئے خود بھی روتا جاتا اور سننے والوں کو بھی رلاتا جاتا، حضرت عمر فاروقؓ نے اس کو دیکھا تو پوچھا: ''متمم! تم کو اپنے بھائی کی جدائی کا کس قدر غم ہے؟۔'' اس نے عرض کیا: ''امیر المؤمنین! ایک عارضے کی وجہ سے میری ایک آنکھ کے آنسو خشک ہو گئے تھے، لیکن بھائی کے غم میں آنسو ایسے جاری ہوئے ہیں کہ آج تک نہیں رکے۔''

حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا: ''یہ غم کی انتہا ہے۔ کوئی بھی کسی جانے والے کا اتنا غم نہیں کرتا۔''

پھر آپ نے متمم سے بھائی کے غم میں کہا ہوا کوئی مرثیہ سنانے کی فرمائش کی۔ اس نے رقتِ انگیز لہجے میں ایک دلدوز مرثیہ پڑھا جس کے آخر کے شعر یہ تھے:

وکنا کندمانی جذیمة حقبة

من الدهر حتیٰ قیل لن یتصدعا

فلما تفرقنا کانی ومالکاً

لطول اجتماع لم نبت لیلة معا

(ہم دونوں جذیمہ (بادشاہ) کے مصاحبوں کی طرح مدت تک ایک ساتھ رہے۔ یہاں تک کہ لوگ کہنے لگے یہ اب ہرگز ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے۔ پھر جب ہم جدا ہو گئے تو گویا میں نے اور مالک نے عرصۂ رفاقت کی درازی کے باوجود ایک رات بھی ساتھ نہیں گزاری۔)

حضرت عمر فاروقؓ یہ مرثیہ سن کر بہت متاثر ہوئے اور متمم سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''اگر میں ایسا مرثیہ کہہ سکتا تو اپنے بھائی زیدؓ کا مرثیہ کہتا۔'' متمم نے عرض کیا: ''امیر المومنین! اگر میرا بھائی آپ کے بھائی کی طرح (میدانِ جہاد میں) شہید ہوا ہوتا تو میں ہرگز اشکباری نہ کرتا۔''

حضرت عمرؓ نے فرمایا: ''تم نے جیسے میری تعزیت کی اس سے بہتر تعزیت کبھی کسی نے نہیں کی۔''

حضرت زیدؓ نے اپنے پیچھے دو بیویاں اور دو بچے چھوڑے۔ بیویوں کے نام لبابہ اور جمیلہ تھے۔ لبابہؓ سے ایک صاحبزادے عبدالرحمن تھے اور جمیلہ سے ایک صاحبزادی اسماء۔ آپ کا مزار سعودی عرب کے شہر ریاض کے شمال میں جبیلہ نامی بستی کے قریب مرکز برکات ہے۔ (طبقات ابن سعد، اسد الغابہ)

اصلاحی مضامین

خواتین کی مسجد آمد: ایک تحقیقی جائزہ

از مولانا محمد توصیف قاسمی*

اسلام میں مساجد کا مقام

مسجد اللہ کا گھر ہونے کی وجہ سے دنیا کی سب سے افضل ومتبرک اور روحانی جگہ، اسلامی معاشرے میں ایک کثیر المقاصد مرکز ہے، جس میں ایک طرف تو اللہ وحدہ لاشریک لہ کی عبادت کی جاتی ہے، اس کی رضا جوئی ہوتی ہے، اسلامی احکام وتعلیمات کو عام انسانوں تک پہنچانے کا کام ہوتا ہے، تو دوسری طرف تمام مسلمان اور اقوام عالم کی رہبری کا سامان بھی کیا جاتا ہے، ابتداء اسلام سے مسجد کا مقصد واستعمال خالق ومخلوق کے درمیان رشتہ استوار کرنے کے حوالے سے ایسا ہی کثیر الجہات رہا۔

مساجد بیک وقت مسلمانوں کی اسلامی، شرعی، وفقہی تعلیم گاہ اور دار العلوم ہیں، اخلاقیات واصلاح باطن کی تربیت گاہ یعنی خانقاہ ہے، اسلامی عدل وانصاف کی کورٹ اور دار العدل ہے، مسلمانوں کے احوال وکوائف کی تدبیر وتشکیل کے لئے ایک پارلیمینٹ اور سینیٹ بھی ہے، اگرچہ مرورِ زمانہ کے ساتھ ان امور کے مقامات میں تبدیلیاں ہوئیں اور مسجد اب نماز کے لئے باقی رہ گئی، لیکن اس سے مسجد کی حیثیت اصلی پر کوئی فرق نہیں پڑتا، بلکہ وہ مسلمانوں کے دلوں میں آج بھی ان تمام امور کا اجتماعی مرکز ہے۔

مساجد کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کا تعلق ایسا ہے جیسے مچھلی کا پانی سے رشتہ ہے، یا جیسے انسان کے لئے ہوا و پانی کی ضرورت، بلکہ اس سے بھی زیادہ، کیونکہ ان اشیاء کے بغیر اس کی جان جاسکتی ہے، لیکن ایک مسلمان کا مسجد سے رشتہ ٹوٹ جانے کے سبب اس کا ایمان خراب ہوجاتا ہے، جان تو جانے والی ہے، جائے گی، لیکن ایمان چلا گیا تو ہمیشہ کا خسارہ اور غضب الٰہی کی مار ہے۔

البتہ عورتوں کے لئے مساجد کی مرکزیت کبھی نہیں رہی، ابتداء اسلام میں جب تک پردہ نہ تھا، تب بھی بڑی بوڑھی خواتین مسجد آکر عورتوں کا حق کفایہ ادا کرتیں، خود سیکھ کر گھر جا کر پردہ نشیں جوان بچیوں کو سکھاتیں، پردہ کے حکم کے بعد اس میں مزید سختی ہوئی اور ان کی آمد کم سے کم تر ہوگئی، اب زمانہ نبوت کے اخیر عہد میں وہ مردوں

* خادم تدریس معہد الشریعہ لکھنؤ

کے واسطے سے ہی دین اور کارہائے دین سے وابستہ ہوتیں،فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ ۙ یُسَبِّحُ لَهٗ فِیْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ۝۳۶ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِیْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ۔الخ کی تفسیر میں متعدد مفسرین نے یہ بات کہی ہے کہ یہاں رجال کی تخصیص عورتوں کے مقابلہ میں ہے،یعنی مساجد جانا آنا اوراسے مرکزیت بنانا، وہاں کے امور میں شریک ہونا عورتوں کا کام نہیں ہے:

"رِجالٌ" وَخَصَّهُمْ بِالذِّكْرِ دَلَّ عَلَى أَنَّ النِّسَاءَ لَا حَظَّ لَهُنَّ فِي الْمَسَاجِدِ، إِذْ لَا جُمُعَةَ عَلَيْهِنَّ وَلَا جَمَاعَةَ، وَأَنَّ صَلَاتَهُنَّ فِي بُيُوتِهِنَّ أَفْضَل۔(تفسیر قرطبی)

احادیث نبویہ میں خواتین کے لئے ہدایات

خواتین کے مسجد آنے کے سلسلہ میں وارد احادیث نبویہ پر نظر ڈالی جائے تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ خواتین کے لئے گھروں میں نماز پڑھنا افضل ہے، کیونکہ اس میں پردہ کالحاظ اور فتنہ سے اجتناب ہے، بلکہ اس میں اس قدر مبالغہ کیا گیا ہے کہ گھر کے صحن سے افضل دالان میں نماز پڑھنا ہے، دالان سے افضل کمرہ میں نماز پڑھنا ہے، کمرہ سے افضل کوٹھری میں نماز پڑھنا ہے، یہ گھروں میں نماز پڑھنے اوراس پر جمنے، نیز احوط واتقی ہونے کو بتاتا ہے۔

روایات سے خواتین کو مسجد آنے کی اجازت واباحت معلوم ہوتی ہے، اس سے امت میں کسی بھی قابل اعتبار شخصیت کا کوئی اختلاف منقول نہیں،لیکن واقعہ یہ ہے کہ عورتوں کے مسجد آنے کی کوئی ادنیٰ سی بھی ہمت افزائی نہیں ملتی،جس طرح گھروں میں نماز پڑھنے میں مبالغہ آیا ہے، بلکہ جس طرح مردوں کے لئے جماعت مسجد کی پابندی کا حکم ہے،خواتین کے بابت شارع صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی عشر عشیر بھی تحریض وترغیب نہیں دی ہے۔

(۱) عن سالم بن عبدالله عن ابيه عن النبی ﷺ قال: اذا استاذنت امراة احدكم فلا يمنعها۔(صحیح بخاری:۸۷۳) ترجمہ: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر تم میں سے کسی کی بیوی گھر سے مسجد جاکر نماز پڑھنے کی اجازت مانگے تو اسے منع نہ کرو۔

(۲) عن ابن عمرؓ ان رسول اللهﷺ قال: لا تمنعوا اماء الله مساجد الله۔(صحیح مسلم:۴۴۲)

ترجمہ: حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ کی بندیوں کو مسجدوں میں آنے سے نہ روکو۔

(۳) عن ابن عمر ﷺ يقول سمعت رسول الله ﷺ يقول: اذا استاذنكم نساء كم الى المساجد فاذنوا لهن۔(صحیح مسلم:۴۴۲) ترجمہ: عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ جب تم سے تمہاری عورتیں مسجد جانے کی اجازت مانگیں تو انھیں اجازت دے دو۔

(۴)وعن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ: لا تمنعوا اِماء اللہ مساجد اللہ۔ (رواہ ابویعلی ورجالہ رجال الصحیح، مجمع الزوائد ۲/ ۳۶) ترجمہ: امیر المومنین عمر بن خطاب ؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ کی بندیوں کو اللہ کی مسجدوں سے نہ روکو۔

(۵)عن ام حمید الساعدیۃ رضی اللہ عنہ انھا جاء ت النبی ﷺ فقالت: یارسول اللہ! انی احب الصلاۃ معک، قال: قد علمتُ انک تحبین الصلاۃ معی وصلاتک فی بیتک خیر من صلاتک فی حجرتک و صلاتک فی حجرتک خیر من دارک، وصلاتک فی دارک خیر من صلاتک فی مسجد قومک، وصلاتک فی مسجد قومک خیر من صلاتک فی مسجدی۔ (اخرجہ احمد: ۲۷۰۹۰، ابن خزیمہ: ۱۶۸۹، وابن حبان ۲۲۱۷) ترجمہ: حضرت ام حمید الساعدیہ ؓ سے منقول ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں، اورعرض کیا اے اللہ کے رسول! مجھے آپ کے پیچھے جماعت سے نماز پڑھنا پسند ہے، حضور نے ارشاد فرمایا: مجھے معلوم ہے کہ تمہیں میرے ساتھ نماز پڑھنا پسند ہے، لیکن تمہارا کوٹھری میں نماز پڑھنا اپنے کمرے میں نماز پڑھنے سے افضل ہے، اور اپنے کمرے میں نماز پڑھنا اپنے گھر میں نماز پڑھنے سے افضل ہے، اورتمہارا گھر میں نماز پڑھنا اپنے محلہ کی مسجد میں نماز پڑھنے سے افضل ہے، اور اپنے محلہ کی مسجد میں نماز پڑھنا میری مسجد (مسجد نبوی) میں نماز پڑھنے سے افضل ہے۔ چنانچہ پھر انھوں نے اپنے گھر کو ہی مسجد بنالیا اور گھر میں ایک موذن بھی مقرر کیا۔

(۶)عن أم عطیۃ نسیبۃ بنت کعب ؓ: أمَرَنا نَبِیُّنا ﷺ بأَنْ نُخْرِجَ العَواتِقَ وذَواتِ الخُدُورِ وعَنْ أيُّوبَ، عن حَفْصَةَ بنَحْوِهِ وزادَ فی حَدِیثِ حَفْصَةَ رضی اللہ عنہ قالَ: أوْ قالَتْ: العَواتِقَ وذَواتِ الخُدُورِ، ويَعْتَزِلْنَ الحَيَّضُ المُصَلّى۔ (بخاری، حدیث نمبر ۹۷۴) ترجمہ: حضرت ام عطیہ ؓ کہتی ہیں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں حکم دیا کہ ہم عید کے دن سیانی، پردہ نشین بچیوں تک کو عیدگاہ لائیں، اور حائضہ عورتیں آئیں، خوشیوں اور بیان میں شریک ہوں، لیکن عیدگاہ سے دور رہیں۔

(۷) عن ابن عمر ﷺ یقول سمعت رسول اللہ ﷺ یقول: اذا استاذنکم نساء کم باللیل الی المساجد فاذنوا لھن۔ (صحیح مسلم: ۴۴۲) ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر ؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ جب تم سے تمہاری عورتیں ''رات کے وقت'' مسجد جانے کی اجازت مانگیں تو انھیں اجازت دے دو۔

صحابہ کرامؓ کا تعامل وموقف

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا تعامل احادیث مبارکہ کی تعمیل کا ہے کہ خواتین کا مسجد آنا تو مباح ہے، اور مساجد کے بجائے گھروں میں نماز پڑھنا خواتین کے لئے افضل ہے، نیز خوف فتنہ کو حضرات صحابہ کرامؓ نے تدریجاً معمول میں داخل کیا، یہی مناسب بھی تھا کہ جیسے احوال بدلے، حکم بھی بدلے، چونکہ صحابہ کرامؓ کے ایمان واخلاق بعد نبوت بھی اعلیٰ درجوں پر قائم تھے، اس لئے صحابیات کے بالکلیہ مسجد آنے کو بند نہیں کیا گیا، اصل اباحت اور خوف فتنہ کو سامنے رکھ کر ان حضرات کے فیصلہ ہوئے، البتہ بعض امور ان میں اجماعی ومتواتر ہیں جو ہمارے لئے تحقیق حق میں معین ومفید ثابت ہوں گے، صحابہؓ کے اجماعی موقف وتعامل کو سمجھنے سے قبل بعض انفرادی آثار واعمال پر ایک نظر ڈال لی جائے، جن کے بغیر اجماعی موقف کو سمجھنا مشکل ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا اپنے بیٹے سے قطع تعلق اور ان کا موقف

خواتین کی مسجد میں آمد اور اس پر اصرار کرنے والے حضرات سیدنا حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے واقعہ کو مضبوط دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں گویا خواتین کی مسجد آنے کی مخالفت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یا شریعت کی مخالفت ہے، جس کی وجہ سے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے اپنے بیٹے سے ترک تعلق تک کر ڈالا، صحاح کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے یہ حدیث سنائی کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر خواتین مسجد آنے کی اجازت مانگیں تو انھیں نہ روکو، بلکہ مسجد جانے کی اجازت دے دو، یہ سن کر ان کے بیٹے بلال یا واقد بول اٹھے کہ ہم تو اجازت نہیں دیں گے، اس بات پر حضرت عبداللہؓ اتنے ناراض ہو گئے کہ اپنے اس بیٹے سے قطع کلام کرلیا، یہاں تک کہ وفات تک اس سے بات نہیں کی۔ (بخاری:۷۹۹، مسلم:۴۴۲)

واقعہ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ترک تعلق کا یہ قصہ اس مسئلہ کی دلیل تو نہیں، ہاں حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کا معمول خود اس حدیث کے خلاف ضرور ہے، ان کے موقف وعمل کو سمجھنے کے لئے اس مسئلہ اور واقعہ میں منقول مختلف چیزوں کو سامنے رکھ کر غور کرنا ضروری ہے، ورنہ حقیقت حال نہیں ہوسکتی۔

(۱) سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ جن روایات میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا اپنے بیٹے کو ڈانٹنا اور ان سے قطع کلام کرنا وارد ہوا ہے، وہ خود مطلق نہیں ہے، کہ پنجوقتہ کی نمازوں میں عورتوں کو مسجد آنے کی اجازت دی جائے، جب کہ یہ واقعہ ان کے دو بیٹوں کی طرف منسوب ہے، واقد یا بلال، اور کسی میں بلا تسمیہ، لیکن مشترکہ طور پر اتنی بات طے ہے کہ ان بیٹوں سے حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے جو روایت کی ہے وہ مطلق نہیں بلکہ ''باللیل'' کی قید کے ساتھ مقید ہے۔

بخاری و مسلم کی بعض روایات میں یہ قصہ مطلق بغیر ذکر قید ہے،لیکن بخاری (حدیث نمبر:۸۶۵) و مسلم (حدیث نمبر:۴۴۲)ہی میں ایک روایت ''باللیل ''(یعنی رات) کی قید کے ساتھ بھی موجود ہے،اس کے علاوہ ابوعوانہ،ابن خزیمہ اور عبدالرزاق جیسے محدثین نے اپنی کتابوں میں اسے ''لیل'' رات کے ساتھ مقید بتایا ہے اور بتانے والے کوئی اجنبی یا اتفاقی راوی نہیں، بلکہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایات اور علوم کے امین و شارح حضرت نافع ہیں، جسے غلطی یا شک پر محمول کرنا حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے علوم سے ہاتھ دھونے کے مترادف ہوگا۔

علامہ ابن حجرؒ فتح الباری میں فرماتے ہیں: ووقع عندابی عوانة فی صحیحه عن یونس بن عبدالاعلی عن بن عیینة مثله لکن قاله فی آخره "یعنی باللیل" و بین بن خزیمة عن عبدالجبار بن العلاء ان سفیان بن عیینة هو القائل یعنی وله عن سعید بن عبدالرحمن عن بن عیینة قال قال نافع :باللیل، وله عن یحییٰ بن حکیم عن بن عیینة قال جاء نا رجل فحدثنا عن نافع قال انما هو باللیل و سمی عبدالرزاق عن بن عیینة الرجل المبهم فقال بعد روایته عن الزهری قال بن عیینة : وحدثنا عبدالغفار یعنی بن القاسم انه سمع اباجعفر یعنی الباقر یخبر بمثل هذا عن بن عمر قال فقال له نافع مولیٰ ابن عمر : انما ذلک باللیل، و کان اختصاص اللیل بذلک لکونه استر ولا یخفیٰ ان محل ذلک اذا امنت المفسدة منهن و علیهن ۔(فتح الباری)

حافظ ابن حجرؒ کی اس تفصیل سے درج ذیل باتیں واضح ہوجاتی ہیں:

حضرت عبداللہ بن عمرؓ مطلق یعنی دن و رات دونوں میں نہیں، بلکہ صرف رات میں مسجد آنے کی اجازت کی بات کررہے تھے،جن روایات میں باللیل کا ذکر نہیں، وہاں بھی مراد رات ہی ہے،جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ حدیث خود خاص ہے،لہٰذا اس سے عموم یعنی پنجوقتہ نمازوں کے لئے مسجد آنے پر استدلال درست نہیں، اور نہ ہی حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو مجوزین کی فہرست میں لانا دیانت اور تحقیق کی بات ہوگی۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت کو مسجد میں خواتین کی آمد کے حق میں دلیل بنانا خود غلط ہے، کیونکہ اس میں وہ خواتین مسجد آمد کی دلیل یا دفاع نہیں کررہے تھے کہ بیٹے کی مخالفت پر بھڑک گئے ہوں، بلکہ حدیث سے ظاہری معارضہ ہورہا تھا،اس لئے ناراضگی جتائی۔

رہی بات یہ کہ انھوں نے بیٹے سے قطع کلام کیوں کیا تھا تو محدثین نے اس کے متعدد جواب دئے ہیں،حقیقت یہ ہے کہ اس واقعہ کی تاویل ضروری ہے، چنانچہ علامہ ابن حجر شافعیؒ نے یہی توجیہ کی ہے کہ ان کے

بیٹے نے اپنی بات رکھنے میں مناسب الفاظ کا انتخاب نہ کیا، بلکہ کچھ ایسا ہوگیا جیسے حدیث کے مقابلہ میں اپنی بات کہہ رہے ہوں۔

وکأن السر فی ذلک أن بلالا عارض الخبر برأیه ولم یذکر علة المخالفة ووافقه واقد لکن ذکرها بقوله یتخذنه دغلا وهو بفتح المهملة ثم المعجمة وأصله الشجر الملتف ثم استعمل فی المخادعة لکون المخادع یلف فی ضمیره أمرا ویظهر غیره وکأنه قال ذلک لما رأی من فساد بعض النساء فی ذلک الوقت وحملته علی ذلک الغیرة وإنما أنکر علیه بن عمر لتصریحه بمخالفة الحدیث وإلا فلو قال مثلا إن الزمان قد تغیر وإن بعضهن ربما ظهر منه قصد المسجد وإضمار غیره لکان یظهر أن لا ینکر علیه وإلی ذلک أشارت عائشة بما ذکر فی الحدیث الأخیر (فتح الباری)

(۳) حضرت عبداللہؓ کا اپنے ان بیٹے سے قطع کلام اخیر عمر تک ہونا طوالت بیان کرنے کے لئے نہیں، بلکہ اتفاقاً ہے، یعنی قطع کلام کے کچھ دن بعد ان کا یا اُن کے بیٹے کا انتقال ہوگیا، دوسری بات علامہ ابن حجرؒ نے یہ کہی ہے کہ روایت میں قطع کلام کا اضافہ لائق استدلال تب ہے جب کہ وہ ''محفوظ'' ہو، یعنی یہ اضافہ مضبوط سند سے ثابت نہیں۔ فقد وقع فی روایة بن أبی نجیح عن مجاهد عند أحمد فما کلمه عبد الله حتی مات وهذا إن کان محفوظا یحتمل أن یکون أحدهما مات عقب هذه القصة بیسیر (فتح الباری)

(۴) یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے قطع کلام کے واقعہ سے یہ تاثر دینا یا استدلال کرنا کہ وہ خواتین کی مسجد آمد پر مُصر تھے، یہ بالکل غلط نتیجہ ہے، ویسے تو یہ بات فتح الباری میں ابن حجرؒ کے کلام سے ہی سمجھ میں آتی ہے، لیکن دوسری جگہ صراحت بھی مل جاتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ رمضان کی راتوں میں گھر کی خواتین کی اپنے ہی گھر میں کسی باندی سے جماعت کراتے تھے، یہ بہت بڑی دلیل ہے اس بات کی کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ خواتین کے مسجد آنے ہی کے حق میں نہیں، اصرار تو دور کی بات ہے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی ان کے بیٹے سے جو گفتگو ہو رہی تھی وہ تو عام ایام کی بابت تھی، جس میں بیٹے کی مخالفت سے وہ ناراض ہوگئے، مگر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا اپنا ذاتی عمل بھی اس حدیث کے بظاہر خلاف ہے، جو عدم اصرار کی واضح دلیل ہے، رمضان المبارک میں عام مسلمان بھی عام دنوں سے زیادہ اہتمام کرتے ہیں، پھر یہ صحابہؓ ہیں جو عبادات کے بعد والوں سے زیادہ حریص اور پابند تھے، پھر یہ

حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہیں جو شدت اتباع نبوی میں معروف ہیں، نیز یہ تراویح کی نماز بھی دن میں نہیں ہوتی، رات میں ہوتی ہے، اور جیسا کہ اوپر حضرت نافعؒ کے اضافہ سے معلوم ہوا کہ رات میں جانے کی اجازت ہے، اس کے باوجود حضرت عبداللہ بن عمرؓ اپنے گھر کی خواتین کو گھر ہی میں باندی سے جماعت کروا رہے ہیں، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خواتین کی مسجد آمد واجبی تو کیا؟ کوئی استحبابی یا افضل حکم بھی نہیں، اس مسئلہ میں وہ دیگر مانعین صحابہ اور فقہاء سے بالکل جدا نہیں۔

نیز اصول فقہ کا ایک قاعدہ ہے کہ جب کوئی صحابی اپنی ہی روایت کردہ حدیث کے خلاف عمل کرتا ہے تو وہ حدیث واجب العمل نہیں رہ جاتی، دیگر فقہاء اس کے خلاف ہیں، وہ صحابی کی رائے و عمل کو چھوڑ کر ظاہر حدیث پر عمل کرتے ہیں، لیکن یہاں احناف کا مسلک بہرحال راجح اور مضبوط ہے، کیونکہ صحابہؓ کا درجہ تشریع سے کم اور اجتہاد سے بلند ہے، یعنی کوئی صحابی دین میں کوئی چیز حلال و حرام تو نہیں بنا سکتا، لیکن اگر وہ اجتہاد کرتا ہے تو اس کا اجتہاد بعد کے مجتہدین سے کئی معنوں و پہلوؤں سے افضل و برتر ہے۔ نیز دیگر فقہاء صحابی کی مخالفت حدیث کو نسیان وغیرہ ایسی تاویلات پر محمول کرتے ہیں جو کہیں نہ کہیں صحابہؓ پر الزام بنتی ہیں، جب کہ حنفیہ کے یہاں صحابیت کا اکرام ہے، نیز فہم صحابہ کو فہم مجتہد پر ترجیح بھی ہے۔

پھر فقہاء کا یہ اختلاف بھی وجوب میں ہے، اور ہمارا مسئلہ تو اجازت محض اور افضلیت کا مسئلہ ہے، استحباب کا بھی نہیں، کہ جس میں راوی کو روایت کے انداز کے سبب مصرین میں شمار کیا جائے۔

(۵) حضرت عبداللہ بن عمرؓ خواتین کے مسجد آنے کو خود پسند نہ کرتے تھے، چناں چہ روایات میں آتا ہے کہ و کان ابن عمر رضی اللہ عنہ یقوم بحصب النساء یوم الجمعة یخرجهن من المسجد۔ (شرح صحیح البخاری لابن بطال) یعنی: حضرت عبداللہ بن عمرؓ مسجد آنے والی خواتین کو کنکریاں مار کر مسجد سے نکالا کرتے تھے۔

خلاصہ یہ کہ سیدنا حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما خواتین کے مسجدوں میں آنے اور لانے کے حق میں نہیں تھے، نہ انھیں اس پر کوئی اصرار ہی تھا، اور نہ ہی ان کے قول و موقف اور ان کے بیٹے ۔جس سے قطع کلام کیا تھا۔ کے قول میں کوئی فرق و تضاد ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بھی احوال کے تغیر سے خواتین مسجد آنے کے حق میں نہیں تھے، بلکہ انھیں کنکریوں سے ہانکتے تھے۔

لہٰذا سیدنا حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت کے ایک ٹکڑے کو پورے واقعہ اور پس منظر سے کانٹ چھانٹ کر استدلال کرنا کہ وہ عورتوں کے مسجد آنے پر مصر تھے سخت بد دیانتی و کم فہمی ہے، یا پھر ہوی پرستی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

اصلاحی مضامین

عوام کو علماء کی ضرورت کیوں ہے؟

از: مفتی احمد عبید اللہ یاسر قاسمی*

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لئے دو سلسلے جاری فرمائے، ایک کتابُ اللہ اور دوسرا رجالُ اللہ، قرآن مجید اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے دونوں سلسلے ختم کر دیئے گئے، البتہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کے مطابق علماء وارثِ انبیاء اور اسلام کی روحانی و علمی اقدار کے محافظ ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ علماء اور عوام کے درمیان رابطہ جس قدر مضبوط رہا اسی قدر فتنوں سے حفاظت کا سامان ہوا، اور جب کبھی یہ رابطہ کم زور پڑا فتنوں کی چوطرفہ یلغار امت کو زار و نزار کر دیا۔ اس وقت کا بہت بڑا المیہ یہ ہے کہ ہماری عوام علماء کرام سے نہ صرف دور ہو چکی ہے؛ بل کہ انٹرنیٹ سے دین سیکھنے کی عادت نے اُنہیں ملحدین دہریے اور گم راہ فرقوں کا لقمہ تر بنا دیا ہے۔

اس پس منظر میں ایک عام آدم ــــ جو شرفِ اسلام سے مشرف ہے ــــ سے میرا یہ سوال ہے کہ جب جسمانی علاج کے لیے اچھا ڈاکٹر، گھر بنانے کے لیے اچھا انجینئر، مسائل کے تصفیہ کے لیے اچھا وکیل، بزنس اور تجارت کے لئے بھروسہ مند تاجر کا ہونا ضروری ہے تو کیوں دین مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ــــ جس پر چلنا اس کا مقصود زندگی اور جس کی پیروی فرض عین ہے۔ کی صحیح تفہیم اور اس پر عمل درآمد کے لئے ایک ناواقفِ شریعت، ناآشنائے قرآن وسنت شخص کو ایک عالم دین اور ماہر شریعت کی ضرورت نہیں؟؟؟

قارئین سے التماس ہے کہ اس سوال کا جواب پڑھنے سے قبل آپ اپنے قلب پر ہاتھ رکھ کر خود اپنے آپ سے پوچھیں کہ کیا واقعتاً دینی معاملات میں عالمِ دین کی راہنمائی ضروری نہیں؟

عام طور پر روشن خیالوں کی ایک جماعت کی جانب سے علماء دین پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ اللہ کا دین اور نبی کی شریعت تو بہت آسان ہے؛ لیکن ملاؤں نے اس کو مشکل بنا دیا ہے۔ حالاں کہ بات ایسی نہیں ہے بلکہ یہ حقیقت چاشت کے سورج کی طرح واضح اور شفاف ہے کہ بلاشبہ ملت ابراہیمی کا علمبردار اسلام اور رسول رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا لایا ہوا دین ہمہ جہت اور متنوع شعبہائے حیات پر حاوی ہونے کے باوصف؛ یقیناً آسان ہے۔ لایکلف اللہ نفسا إلا وسعها اور الدین یسر کے وسیع معانی ومفاہیم دین متین کی سہولت وآسانی پر

* خادم التدریس ادارہ اشرف العلوم حیدرآباد

دلالت کرتے ہیں؛ لیکن کیا یہ حقیقت کہ قران مجید اور احادیث مبارکہ کی تفہیم اور دین پر عمل آوری کے لیے ایک عامی کا ذہن کافی نہیں؟

کیا دینی مسائل کے حل کے لیے اسے ایک عالم دین سے رجوع نہیں کرنا چاہیے؟

کیا قران فہمی اور حدیث فہمی کے لیے اسے کسی مفسرِ قران یا محدث سے رابطہ نہیں کرنا چاہیے؟

عقائد کی تصحیح اور اعمال کے بگاڑ کو دور کرنے کے لیے کسی متکلمِ اسلام یا متبع شریعت مصلح کے پاس نہیں جانا چاہیے؟

جاننا چاہیے کہ علوم شریعت گہرائی و گیرائی پر مشتمل ہوتے ہیں، معانی ومفاہیم کا ادراک ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے، مثال کے طور پر صرف قرآنی علوم کی گہرائی کی کوئی انتہا نہیں ہے، قرآنی علوم کا تعمق اس قدر ہے کہ کوئی اس کا اندازہ تک نہیں لگا سکتا، قرآن پاک کے معنی کے لیے جو شرائط و آداب ہیں اُن سے متعلق شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اس کے لیے پندرہ علوم دینیہ میں مہارت اور دسترس حاصل کرنا ضروری ہے ۱:علم لغت، ۲:علم صرف، ۳:علم نحو، ۴:علم اشتقاق، ۵:علم معانی، ۶:علم بیان، ۷:علم بدیع، ۸:علم قرات، ۹:علم اصول الدین، ۱۰:علم اصول فقہ، ۱۱:علم اسباب النزول، ۱۲:علم ناسخ ومنسوخ، ۱۳:علم فقہ، ۱۴:علم حدیث، ۱۵:نورِ بصیرت اور وھبی علم۔ اور ان میں سب سے اہم علم وھبی ہے جو کہ حق سبحانہ وتقدس کا عطیہ خاص ہے، وہ اپنے مخصوص بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں عطا فرماتے ہیں، مزید آگے چل کر لکھتے ہیں: تھوڑی عربی جان کر لینے یا اردو ترجمے دیکھ کر اگر کوئی اپنی رائے داخل کرے گا تو یہ سراسر گمراہی ہوگی۔ (ماخوذ از: فضائل قرآن از شیخ الحدیث رحمہ اللہ)

جب قرآن کی تفسیر اور اس کی تفہیم کے لئے ایک عالم کے واسطے بھی اتنے علوم لازم ہیں تو غور کریں کہ ایک عام آدمی کو قرآنی علوم سے واقفیت کے لئے کتنے علوم کو جاننا ضروری ہوگا؟ رہا علم حدیث کا معاملہ، سو وہ بالکل الگ ہے صرف علم حدیث کے اقسام ہی ۱۰۰ سے متجاوز ہیں، (جن کو اس مضمون میں ذکر کرنے کی گنجائش نہیں) پھر ان دونوں سے مستنبط علم فقہ (مسائل ودلائل) کی اپنی انفرادیت ہے۔

الغرض دین کی صحیح تفہیم وتعبیر، تعلیم وتعلم، کوئی آسان کام نہیں ہے کہ ہر کہ ومہ روشن خیال، دینی علوم سے ناواقف، داڑھی صاف کر کے سنتِ نبی کا مذاق اڑانے والا، ارکان اسلام کو چھوڑنے والا، اسلامی طرزِ زندگی سے انحراف کرنے والا، حلال وحرام کی تمیز ختم کرنے والا، عورتوں کو بے پردہ کرنے والا، جان بوجھ کر سنتوں کو ترک کرنے والا قرآن فہمی کا دعویٰ کر کے مفسر ومحدث بن جائے اور نہ ہی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت اس

قدر بے حیثیت ہے کہ عربی کی ایک معمولی عبارت پڑھنے اور سمجھنے پر قدرت نہ رکھنے والا بھی قرآن وسنت کے نام پر رائے زنی کر کے امت کو مسائل بتلانا شروع کردے۔

لیکن صد افسوس کہ آج امت اسی راہ پر چل رہی ہے، علماء دین سے دور ہوکر، نام نہاد اسکالروں کو اپنا دینی راہنما و شرعی رہبر مان رہی ہے، ڈاکٹرز، ایڈوکیٹز، انجینئرز اور تجار کو دینی معاملات میں اپنا پیشوا اور مقتدا بنارہی ہے۔(الامان والحفیظ)

عوام کو سوچنا چاہیے کہ جس طرح ہر اوپر سے حسین وجمیل نظر آنے والی چیز واقعتاً اندر سے بھی دلکش وخوبصورت نہیں ہوتی جیسے سانپ کا ظاہری نقش رنگ برنگا، جاذب نظر، اور دل کو لبھانے والا ہوتا ہے؛ مگر اس کے باطن میں ہلاکت خیز زہر ہوتا ہے جس سے آدمی کی جان سلب ہوجاتی ہے یقین مانیے! اللہ کی قسم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حرمت کی قسم! اسی طرح اس پر فتن دور میں یہ نام نہاد انجینیر، ڈاکٹر، ایڈوکیٹ، اور تاجر بھی اسلام اور قرآن کا پاکیزہ عنوان دے کر، سنت اور حدیث کا خوش نما نام دے کر، تصوف وسلوک کا ظاہری رنگ دکھا کر، دین کے نام پر بے دینی، مذہب کے نام پر لامذہبیت، حیا کے نام پر بے حیائی کا زہر دے رہے ہیں، اور ایک عام آدمی کو دام فریب میں پھنسا کر اس کے قلب سے ایمان ویقین کی متاعِ گراں مایہ کو سلب کررہے ہیں، اللہ تعالیٰ کے وجود کو مشکوک بنارہے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ پر مختلف قسم کے اشکالات پیدا کررہے ہیں، قرآنی آیات میں تحریف کررہے ہیں، اور اللہ ہی رحم فرمائے امت کو ایسی ضلالت میں ڈھکیل رہے ہیں جہاں سے پھر ان کا ایمان کی طرف عود کرنا مشکل معلوم ہورتا ہے۔(الا ماشاء اللہ)

ایک عام آدمی اگر من چاہی طرز پر قرآن مجید میں رائے زنی کر کے قرآن فہمی کا دعویٰ کرے گا اور قرآن بیانی شروع کردے گا اور کوئی بھی آیت کریمہ پڑھ کر علم دین سے واقفیت کے بغیر ایسا مطلب نکالے گا جو قرآن وسنت کے مزاج کے موافق ومطابق نہ ہو تو وہ شخص حق تعالیٰ کی طرف ایسی بات منسوب کرنے والا ہوگا جو اللہ تعالیٰ نے ارشاد ہی نہیں فرمائی، اس طرح یہ شخص اللہ کے نزدیک سب سے بڑا ظالم شمار ہوگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا (سورة الكهف: ١٥) ترجمہ: پس اس سے بڑا ظالم کون ہوگا، جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھتا ہے؟

نیز نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی ایسے ہی شخص کے متعلق ارشاد فرمایا: من قال في كتاب الله عز وجل برأيه، فأصاب فقد أخطأ. (سنن ابی داود، کتاب العلم، باب الکلام فی کتاب اللہ بغیر علم، 5/494، ط: دار الرسالۃ العالمیۃ)

ترجمہ: جس نے قرآن کی تفسیر اپنی رائے (اور اپنی صواب دید) سے کی، اور بات صحیح ودرست نکل بھی گئی

توبھی اس نے غلطی کی۔

ایسے ہی لوگوں کے متعلق ایک اور حدیث میں مروی ہے: عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال: قال رسول الله ﷺ: من قال في القرآن برأيه فليتبوأ مقعده من النار۔ وفي رواية: من قال في القرآن بغير علم فليتبوأ مقعده من النار. (مشکاۃ المصابیح، کتاب العلم، الفصل الثانی، 1/79، رقم الحدیث:234، ط: المکتب الاسلامی بیروت)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس نے قرآن میں اپنی عقل ورائے سے کچھ کہا تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔ اور ایک روایت میں ہے: جس نے بغیر علم کے (بغیر سمجھے بوجھے) قرآن کی تفسیر کی، تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔

ایسے ہی قرآن مجید میں تفسیر بالرائے کرنے والے کے متعلق امام سیوطی رحمہ اللہ امام ابوطالب طبری رحمہ اللہ کے حوالہ سے لکھتے ہیں: وقال الإمام أبو طالب الطبري في أوائل تفسيره: القول في أدوات المفسر: اعلم أن من شرطه صحة الاعتقاد أولاً، ولزوم سنة الدين، فإن من كان مغموصاً عليه في دينه لا يؤتمن على الدنيا فكيف على الدين، ثم لا يؤتمن من الدين على الإخبار عن عالم، فكيف يؤتمن في الإخبار عن أسرار الله تعالى؛ ولأنه لا يؤمن إن كان متهما بالإلحاد أن يبغي الفتنة ويغر الناس بليه وخداعه.

(النوع الثامن والسبعون: فی معرفۃ شروط المفسر وآدابہ، 4/200، ط: الھیئۃ المصریۃ العامۃ للکتاب)

ترجمہ: جاننا چاہیے کہ مفسر کی شرائط میں سے ایک یہ بھی ہے کہ پہلے تو اس کا عقیدہ صحیح ہو، دوسرے وہ سنتِ دین کا پابند ہو، کیوں کہ جو شخص دین میں مخدوش ہو، کسی دنیوی معاملہ میں بھی اس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا تو دین کے معاملے میں اس پر کیا اعتماد کیا جائے گا، پھر ایسا شخص اگر کسی عالم سے دین کے بارے میں کوئی بات نقل کرے، اس میں بھی وہ لائق اعتماد نہیں تو اسرارِ الٰہی کی خبر دینے میں کس طرح لائق اعتماد ہوگا، نیز ایسے شخص پر اگر الحاد کی تہمت ہو تو اس کے بارے میں یہ اندیشہ ہے کہ وہ تفسیر بیانی کے ذریعہ فتنہ کھڑا کردے اور لوگوں کو اپنی چرب زبانی ومکاری سے گم راہ کرے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ لکھتے ہیں: جھوٹ برائی کی جڑ ہے اور اس میں سے سب سے سنگین اللہ عزوجل پر جھوٹ باندھنا ہے۔ (الجواب الصحیح لمن بدّل دین المسیح علیہ السلام ۱/۳۰۔)

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کا چشم کشا واقعہ

مفسر قرآن حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ تفسیرِ مظہری میں یہ واقعہ لکھتے ہیں: حضرت

عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ اپنا واقعہ خود بیان کرتے ہیں کہ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ نازل ہوئی تو میں نے ایک سیاہ اور ایک سفید دھاگہ لیا اور ان کو اپنے تکیہ کے نیچے رکھ لیا اور رات میں ان کو دیکھا تو مجھ کو دونوں میں کچھ فرق نہ معلوم ہوا، صبح کو میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس کا ذکر کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اس سے تو رات کی سیاہی اور دن کی سفیدی مراد ہے (اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے) اور ایک روایت میں ہے کہ پھر آپ نے فرمایا: کہ تو عریض القفا (کم عقل) ہے یہ تو دن کی سفیدی اور رات کی سیاہی ہے۔ (ماخوذ از تفسیرِ مظہری، سورۃ البقرہ آیت نمبر: ۱۸۷)

قارئین اس واقعہ کو بار بار پڑھیے اور موعظت حاصل کیجیے، حضرت عدی بن حاتم طائی ایک جلیل القدر صحابی ہیں، خاندانی وجاہت کی وجہ سے بڑی عزت و وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے آپ سے 66 روایتیں حدیث کی کتابوں میں منقول ہیں۔ ان میں سے چھ متفق علیہ ہیں اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اہل لسان ہیں، لیکن مرادِ قرآن کو اس وقت تک نہیں سمجھ پائے جب تک کہ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی وضاحت نہ فرمائی۔

ایک جلیل القدر صحابیِ رسول، ایک اہل لسان عربی شناس شخص قرآن فہمی میں نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وضاحت کے محتاج ہیں تو ایک عامی کے لئے کیسے ممکن ہے کہ وہ قرآن مجید کو کسی استاذ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کئے بغیر سیکھ لے؟

یہ ایک حقیقت ہے، آپ اُمت مسلمہ کی تاریخ کا گہرائی سے مطالعہ کریں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ بہت سے ایسے فکری اور نظریاتی فرقے جن سے اُمت میں افتراق و انتشار پیدا ہوا ہے ان کی بنیادی وجہ قرآن و حدیث کی من مانی تشریح ہے۔ آج عجیب و غریب معاملہ چل رہا ہے کہ انجینئر، وکیل، ڈاکٹر اور تجار، بجائے اس کے کہ وہ عالمی طور پر اپنے میدان میں جدید تحقیقات کے ذریعہ اپنا نام روشن کریں، اپنی فیلڈ میں کامل مہارت حاصل کر کے پوری دنیا میں اپنا لوہا منوائیں اور اس میدان میں اُمت کو درپیش چیلنجز کا حل پیش کریں، وہ اپنی ذمہ داریاں تو تندہی سے انجام نہیں دے رہے، مگر دینی مسائل میں رائے زنی کو ضروری سمجھ رہے ہیں، یعنی ایسے لوگوں کی کوئی کمی نہیں ہے جن کو اُن کے اپنے شعبے میں تو کوئی خاص مہارت حاصل نہیں ڈ؛ مگر وہ دینی مسائل میں عوامی سطح پر فتوی دینے کو پیدائشی حق سمجھنے لگتے ہیں، یہ بالکل غلط روش ہے اور امت مسلمہ کی تاریخ اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ جو تحقیق کی آڑ میں شریعت کی من مانی تشریح کرتا ہے وہ خود بھی گمراہ ہوتا ہے اور امت کو گمراہی میں ڈالتا ہے۔

اصلاحی مضامین

قرض واپسی آج کا اہم مسئلہ

حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب قاسمی*

اللہ تعالیٰ نے انسانی معاشرے کی بنیاد باہمی اخوت ومحبت پر رکھی ہے اور انسانوں کی ضروریات کا تعلق ایک دوسرے سے جوڑے رکھا ہے، ایک فرد کو اپنے کسی عزیز دوست سے کوئی مدد کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ اکثر مالی ہی مدد ہوتی ہے۔ اپنی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے قرض کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ قرض دینا شریعت کی نگاہ میں ایک پسندیدہ اور مستحب عمل ہے، قرض ایک ایسی ضرورت ہے کہ بسا اوقات اس کے سوا کوئی راستہ نہیں رہتا، شریعت میں اگر قرض دینے کا راستہ نہ ہوتا تو معاشرہ سود جیسی لعنت ہی میں گرفتار رہ جاتا۔ اسلام نے پریشان حال اور ضرورت مند کو قرض دینے کو بہترین عمل قرار دیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ بات ذہن میں رہنا چاہیئے کہ اسلام نے جو قرض کی اجازت دی ہے وہ انتہائی ضرورت اور جائز کام کے لئے ہے۔

فضول خرچی کے لئے یا کسی گناہ کے کام کے لئے، نام ونمود کے لئے (جیسے شادی بیاہ کے لئے قرض لیا جاتا ہے) نہ قرض لینا جائز ہے نہ دینا جائز ہے اور ایسے کاموں کے لئے قرض دینے والا گنہ گار ہوگا، کیونکہ گناہوں کے کاموں میں معاون و مددگار بن رہا ہے۔ اور قرآن کا صاف اعلان ہے تم گناہ اور غلط کاموں میں مددگار مت بنو، اسلام نے ضرورت مند کو قرض دینے کی تو فضیلت بیان کی لیکن قرض لینے والے کے لئے بہت ہی حدود اور قیود مقرر کی ہیں، بلاسخت ضرورت کے قرض نہ لیا جائے، ایک صحابی کا انتقال اس حالت میں ہوگیا کہ ان پر قرض تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی نماز جنازہ پڑھانے سے گریز کیا، جب حضرت علیؓ نے قرض کی ضمانت لی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز جنازہ پڑھائی، ایک اور حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ شہید فی سبیل اللہ کے تمام گناہ معاف فرمادیں گے لیکن اس کے ذمہ واجب الادا قرض کو معاف نہیں فرمائیں گے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "جو شخص لوگوں کا مال بطور (قرض) لے اور اس کے ادا کرنے کی نیت رکھتا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف سے (قرض ادا کرے گا، اور جس شخص نے مال بطور قرض لیا اور نیت ادا کرنے کی نہیں رکھتا تو اللہ تعالیٰ اس شخص کو اس کی وجہ سے تباہ کردے گا۔ اسلام نے جہاں قرض دہندہ کو تعلیم دی ہے کہ جب اپنے

* مہتمم مدرسہ ضیاء العلوم انت پور

قرض کا مطالبہ کرے تو اچھے طریقے سے کرے، اسی طرح مقروض کو بھی تلقین کی ہے کہ جب وہ قرض ادا کرنے کی استطاعت رکھتا ہوتو فوراً ادا کردے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مالدار کا ٹال مٹول سے کام لینا ظلم ہے، قرض ادا کرنے کی استطاعت رکھنے کے باوجود ادائیگی میں کوتاہی بہتر نہیں" (ابن ماجہ)

ابن ماجہ ہی کی ایک اور روایت ہے کہ مومن کی روح اس کے قرض کے ساتھ معلق رہتی ہے کہ تا آنکہ اس کی طرف سے ادا نہ کردیا جائے۔ حضرت عبداللہ بن عمر سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد منقول ہے کہ اگر کسی کا انتقال ہو اور اس پر ایک دینار یا درہم بھی باقی (قرض ہوں تو اسے اس کی نیکیوں سے وصول کیا جائے گا (ابن ماجہ) یہ تمام حدیثیں قرض کے بوجھ کو واضح کرنے کے لئے کافی ہیں کہ ہمیں قرض کو معمولی نہیں سمجھنا چاہئے۔ لیکن آج کے معاشرہ میں قرض لینے کی جو صورت حال ہے، ضرورت اور غیر ضرورت کا خیال کئے بغیر جتنا قرض مل جائے آدمی لینے کے لئے تیار ہے کیونکہ اس کو ادا کرنے کا خیال نہیں ہوتا الا ماشاء اللہ۔ قرض لینے کے وقت اپنی مجبوری بے کسی اور پریشان حالی کا رونا روکر اپنے تعلقات والے سے قرض حاصل کر لیتا ہے پھر نہ تو دینے کی نیت ہوتی ہے نہ اسکی کوشش ہوتی ہے اور جب تک قطع تعلق کی نوبت نہیں آجاتی قرض کی ادائیگی! نہیں ہوتی، قرض دینے والا اپنے قرض کے لئے پریشان ہوتا ہے اس کے گھر کے چکر لگاتے لگاتے چپل گھس جاتے ہیں۔

خود میرے ساتھ زندگی میں کئی واقعات پیش آئے ایک صاحب نے تین دن کی مہلت پر قرض لیا کئی مہینے تعلقات ختم کرنے کے بعد رقم ملی، ایک صاحب سے تعلقات تھے قرض مانگا دید یا 15 یوم کا وعدہ تھا ایک ماہ کے بعد پوچھا تو آج کل کا بہانہ کیا پھر ملنا چھوڑ دیا، آج کو 5 سال ہو گئے رقم لیکر خاموشی اختیار کر لی تعلقات ختم کر دئے۔ میں نے صبر کر کے اس معاملے کو اللہ کی عدالت میں پیش کر دیا ہے۔ آقا مدنی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا قرض محبت کو کاٹتا ہے، یہ حدیث آج کے دور میں سو فی صد صادق آرہی ہے۔ کتنے لوگ ایسے ملیں گے جو اپنی پریشان حالی بتا کر قرض تو لے لیتے ہیں مگر ان کا ارادہ دینے کا نہیں ہوتا اگر ان سے قرض کی واپسی کا تقاضہ کیا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہاں لکھا ہے کون اس کا گواہ ہے، چونکہ قرض حسنہ میں دیتے وقت نہ تو کوئی تحریر لکھی جاتی ہے نہ کوئی اس پر وہ مقرر کیا جاتا ہے بس تعلقات اور اعتماد بھروسہ پر رقم دی جاتی ہے اور یہی چیز یعنی نہ لکھنا اور نہ گواہ بنانا قرض واپس نہ کرنے والوں کے لئے فائدہ مند ثابت ہوتی ہے، اور قرض دینے والا ایک بڑی مصیبت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔

اس لئے آج کے ماحول میں اگر اپنے دوستوں سے تعلقات برقرار رکھنا ہے تو قرض حسنہ دینے میں احتیاط سے کام لیں، بلکہ اگر اللہ نے مال و دولت دیا ہے تو جتنا ہو سکے، فی سبیل اللہ تعاون کر دیں، اسی میں عافیت ہے۔

فکرونظر

الیکشن سے قبل ہندتوا ایجنڈا "رضاکار فلم"

از: مفتی محمد سلمان قاسمی محبوب نگر *

انسانی خیالات کے بننے بگڑنے میں مشاہدہ بڑا اثر دار ہے انسان جو چیزیں پڑھتا ہے اس کے بارے میں تردد ہوسکتا ہے کہ یہ امر واقعی ہے یا نہیں؟، اسی طرح سنی ہوئی باتوں کے متعلق خلجان ہوسکتا ہے کہ یہ ہوائی باتیں ہوں، مگر جن چیزوں کو انسان بہ چشم خود دیکھتا ہے اور جو باتیں اس کے پردۂ نظر سے ٹکراتی ہیں وہ اس کا نظریہ اور اعتقاد بن جاتی ہیں، اور ان کے سچ و برحق ہونے کا وہ یقین کرنے لگتا ہے، فلم بینی اس وقت ایک روگ اور فیشن بن چکا ہے، بیشتر لوگ اس کے عادی اور دل دادہ ہوچکے ہیں، تو اہل باطل کے ذہنوں میں یہ خیال پنپا کہ انہی فلموں، ڈراموں کے ذریعے لوگوں کی آئیڈیالوجی تبدیل کی جائے، چنانچہ عشق ومحبت کی داستانیں، رومانوی فلمیں اور ہم جنس پرستی کو فروغ دینے والے ڈرامے وغیرہ بنا بنا کر نسلِ انسانی اور نوجوانوں کے افکار کو پراگندہ کیا جانے لگا، پھر رفتہ رفتہ اپنے اندرون مخفی اسلام دشمنی کے تناظر میں وہ اپنے فلموں اور ڈراموں میں اسلام مخالف مدعوں کو بڑے شد و مد کے ساتھ پیش کرنے لگے، اور ایسی فلموں کو منظر عام پر لانا شروع کیا جس سے عالمی پیمانے پر اسلام کی بدنامی ہو، اور لوگوں کے ذہنوں میں عمومی طور پر اسلام کے تعلق سے منفی تاثرات قائم ہوجائیں؛ یہ مرض کئی صدیوں تک ہالی وڈ (یورپی وانگریزی) فلموں تک محدود رہا اور ہندوستانی فلمیں عشق و محبت کی کہانیاں، سیاسی شعور بیداری اور سماجی پیغامات اور باہمی میل ملاپ اور خاندانی تعلقات کی بحالی وغیرہ پر مبنی ہوا کرتی تھیں؛ لیکن تقریباً ایک دہائی قبل سے بلکہ زعفرانی جماعت کی پشت پناہ پارٹی کے وزارت عظمی پر براجمان ہونے کے بعد ملک بھر میں ہندو مسلم کشاکشی زوروں پر ہوگئی، تو اس کے زہریلے اثرات فلم سازوں اور ہدایت کاروں کے اذہان پر بھی حاوی ہوگئے، اور انہوں نے بھی ایسی فلموں کو تشکیل دینا شروع کیا جس سے ملکی امان کی پامالی اور انتشار میں اضافہ ہو، اور اندر ہی اندر ان اسٹوری نگاروں اور ہدایت کاروں کو رائٹ ونگ ذہنیت کے لوگ اور برسر اقتدار پارٹی کے قائدین کی جانب سے خوب ستائش حاصل ہوئی، نیز ان کو بیک سپورٹ اور ہمت وتقویت فراہم کی گئی، ان تمام کا مقصد محض ہندوستانیوں کے ذہن میں مسلمانوں کے تعلق سے نفرت کا بیج بونا اور مذہبیت کی بنا پر ہندوؤں کو متحد کر کے ہندو راشٹر کی تشکیل ہے، عمومی طور پر آج جو فلمیں بن رہی

* خادم التدریس ادارہ اشرف العلوم حیدرآباد

ہیں ان کے گنے چنے کانسپٹ ہیں، ایک فلموں میں مسلمانوں کو دہشت گرد، غدار، اور امن عالم کا دشمن اور تمام فسادات کا ضامن قرار دیا جائے؛ چنانچہ فلم سازوں نے اس کے لیے پڑوسی ملک اور ہندوستان کے مابین کشیدگی کا سہارا لے کر

Baby,Kabul express, Article 15,Uri the surgical strike وغیرہ جیسی متعدد فلمیں بنا کر ریلیز کیں جن میں ہندو پاک کے درمیان کی جنگوں جھڑپوں کو بنیاد بنا کر مسلمانوں کے بابت ہندوؤں کے جذبات کو ابھارا گیا، دوسرے ہندوستان میں ایک طویل عرصے تک مسلم بادشاہوں کا راج رہا، چونکہ وہ اپنے دور حکومت میں اسلامی حدود و قیود کے پابند تھے، ان کو احساسِ منصب کے ساتھ خلق خدا کے متعلق خدا کے حضور جواب دہی کی فکر بھی دامن گیر تھی، تو اس لیے انہوں نے بڑی عدل گستری و انصاف پروری کے ساتھ ملک کے زمامِ اقتدار کو سنبھالا، اور تمام مذاہب کے لوگوں کے ساتھ مساویانہ رویہ اختیار کیا، لیکن اس تاریخ کو علی حالہ باقی رکھتے ہوئے ہندو راشٹر یا اکھنڈ بھارت کا خواب شرمندہ تعبیر ہونا ناممکن تھا تو انہوں نے مسلم بادشاہوں کی زندگیوں کو اپنی فلموں کا کانسپٹ بنایا جس میں ان کی حقیقی تاریخ کو مکمل مسخ کر کے من گھڑت قصوں کو وقائع اور حقائق باور کرانے کی کوشش کی گئی، چناچہ

Shivaji Maharaj, Takht, Samrath prithvi raj, Padmavat وغیرہ فلمیں سامنے آئیں جن میں ہندوستانی مسلم فرمان رواؤں مثلاً سلطان محمود غزنوی، علاء الدین خلجی، اورنگ زیب عالمگیر اور دیگر مغل شاہوں کی کردارکشی کی گئی اور ان کو کہیں ظالم، کہیں عاشق، کہیں بزدل اور کہیں ہندوؤں کے ساتھ ظالمانہ سلوک کرنے والا بتایا گیا، تیسرے اسلامی تعلیمات کا مذاق اڑانے کے لیے

Hum 2 Hamare 12 , 72 hooren, Lipstick under my burqa اور اس جیسی فلمیں منظر عام پر لائی گئیں تاکہ اسلامی تعلیمات اور اسلامی تمدن سے لوگوں کو چڑھ پیدا ہو جائے، پھر ان فلموں کو سیاسی رنگ دینے اور عین الیکشن کے وقت مسلمانوں کے خلاف غیض وغضب کو برانگیختہ کرنے کے لیے ملک میں پیش آمدہ دنگوں کو مسلمانوں پر تھوپنے کی کوشش کی گئی اور تا ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے، چنانچہ حال ہی میں کچھ واقعات کو اس طرح فلمایا گیا کہ انتہا پسند لوگوں کے علاوہ سنجیدہ ہندو عوام بھی لفظ مسلم سن کر دانت پیسنے لگے؛

چنانچہ مدھیہ پردیش اور بنگال الیکشن کے بالکل قریب The Kashmir Files کو ریلیز کیا گیا جس میں ایک طرفہ کہانی دسیوں جھوٹ شامل کر کے دکھائی گئی کہ مسلمانوں نے کشمیری پنڈتوں کا قتل عام کیا جب کہ جو مظالم کشمیری مسلمانوں نے جھیلے ہیں اور ابھی تک جھیل رہے ہیں اس کی جھلک تک نہیں بتلائی گئی، پھر کرناٹک

الیکشن کے عین وقت The Kerala story کے نام سے ایک فلم ریلیز ہوئی جس میں یہ بتایا گیا کہ مسلمان ہندولڑکیوں کو اغوا کرنے کے بعد ان کا برین واش کررہے ہیں، اور ان کو جبراً مسلمان بنا کر تقریباً 40 ہزار کی تعداد میں ہندولڑکیوں کو عراق وشام اور افغانستان کی جہادی تناظم میں شمولیت پر مجبور کیا گیا، حالانکہ حقیقی واقعہ صرف تین یا چار لڑکیوں کا ہے جن میں ہندولڑکی صرف ایک تھی لیکن اس طرح کے مظالم جھیلنے والی لڑکیوں کی تعداد 40 ہزار بتا کر مسلمانوں کے متعلق غنڈہ گردی، جبری طور پر اسلام کی تبلیغ اور دہشت گردانہ ذہنیت کا زہریلا تاثر لوگوں کے ذہنوں میں ڈالنے کی نامشکور سعی کی گئی۔

یہ آج کل کے ہندوستانی فلموں کا مختصر سا پس منظر ہے جس کو سیاسی رنگ دے کر ہندو مسلم کھیل کھیلا جارہا ہے، اور اقلیتوں اور اکثری طبقے کے بین خلیج کو طول دینے کی کوشش کی جارہی ہے، جنوبی ہندوستان بالخصوص حیدرآباد وتلنگانہ ہندو مسلم تہذیبی میل ملاپ اور اخوت و بھائی چارگی کا مظہر ہے، یہاں کے لوگوں میں مذہبی تعصب اور نسلی امتیاز بہ نسبت شمالی ریاستوں کے کم ہے، تو یہاں پر نفرت کا بازار گرم کرنے اور لوگوں میں تشدد برپا کرنے کے لیے ہندتوا تنظیمیں اور بی جے پی قائدین اشتعال انگیز بیانات کے ذریعے ماحول بگاڑنے میں لگے ہوئے ہیں، اس کے باوجود مسلمانوں کے بابت جو تعصب لوگوں کے دلوں میں ڈالنا مقصود تھا اور ہندو ووٹوں کو یکجا کر کے بی جے پی کو اقتدار میں لانے کا جو منصوبہ ہے وہ اس درجے کامیاب ہوتا نظر نہیں آیا، اور ہندو طبقہ شمال کے بالمقابل کسی حد تک سیکولر ذہنیت پر بدستور باقی ہے تو شاہان ہند کی طرح نظامانِ دکن کو بدنام کرنے اوران کے عدل وانصاف پر مبنی کریکٹر کو بگاڑ کر ظالم وجابر کے طور پر ان کو روشناس کرانے کے لیے ایک تیلگو فلم **"رضا کار"** کے نام سے ریلیز ہونے کو ہے، جس کا تقریباً ڈیڑھ منٹ کا ٹریلر حال ہی میں فلم سازوں کی جانب سے ریلیز کیا گیا، فلم کے خفیہ ایجنڈے کو واشگاف کرنے سے پہلے مناسب ہے کہ ہم مختصراً رضا کار قوم کی تاریخ جان لیں، نظام دکن جناب میر عثمان علی صاحب کی ایک نہایت باوفا مخلص اور قوم کا درد رکھنے والی شخصیت جناب قاسم رضوی صاحب ہیں انہوں نے باشندگان دکن اور حکومت دکن کے تحفظ کی خاطر بہت کچھ داؤ پر لگا دیا، اور اسی کے تئیں اقدامات کے تحت انہوں نے رضا کار تنظیم کی داغ بیل ڈالی، غرض 1947 کی بات ہے کہ جب اہلِ ہند برطانوی سامراج کی طویل غلامی سے خلاصی کی جنگ لڑ رہے تھے بالآخر سب کی مشترکہ کوششوں سے ملک آزاد ہوا، پھر بہ مشیت ایزدی تقسیم ہند کا قضیہ نامرضیہ افتاد ہوا، اور اہل ہند جو اب تک متحدہ محاذ بنا کر فرنگیوں کے خلاف برسرپیکار تھے باہمی ہاتھا پائی کا شکار ہوگئے، ایسے میں اطراف کی چھوٹی ریاستیں کشمیر و دکن وغیرہ کو ہند یا پاک میں ضم اور منسلک کرنے اوران کی خود مختاری کو سلب کرنے کے منصوبے بنائے جانے لگے جو پہلے

سے ملکی قائدین کے پلان کا حصہ تھا، سرزمین دکن پر گویا ایک طرح کے مہیب بادل منڈلا رہے تھے، ایسے آڑے وقت میں بل کہ آزادی سے کچھ قبل" 1946 ہی میں دکن کی واحد نمائندہ جماعت کے با اعتماد صدر مولوی قاسم رضوی نے ملک (دکن) کو درپیش خطرات سے بچانے کے لئے عظیم جد و جہد شروع کی، 11 جون 1947ء کو فرمانرواءِ سلطنت حضور نظام نے عالم وجود میں آنے والے نو زائد آزاد ممالک ہندستان یا پاکستان میں شمولیت نہ کرنے اور کامل خود مختار و آزاد رہنے کا اعلان کیا، 15 / اگسٹ 1947 کو ہندوستان کی آزادی کے بعد جب کہ اقطاعِ ہند میں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جا رہی تھی، لوٹ مار، اغواء، عصمت ریزی اور قتل وغارت گیری کا بازار گرم تھا، ہند کی فوج اور پولیس بھی اعلانیہ اس میں شریک تھی، حکومت کی مشنری مفلوج قانون کا احترام ختم اور امن وامان تباہ ہو گیا تھا، اس وقت برصغیر ہند میں صرف اور صرف ایک حیدرآباد کی آزاد اسلامی سلطنت ہی ایسی تھی جہاں امن وامان اور ہندو مسلم اتحاد و بھائی چارگی، مذہبی وشخصی آزادی اور خوش حالی کا دور دورہ تھا، حیدرآباد کی غیر مسلم رعایا چین وسکون کی بانسری بجا رہی تھی؛ ہند یونین اور اسٹیٹ کانگریس نے حیدرآباد کے مسلم اقتدار کے خاتمہ اور اس کی ہند یونین میں شرکت کے لئے دباؤ ڈالنے اور ملک کے اندرونی امن وامان کو درہم برہم کرنے کے لئے جب اپنے تخریبی منصوبوں پر عمل کرنا شروع کیا تو قائد محترم قاسم رضوی نے حالات کی سنگینی کے پیش نظر اپنی حکومت کی مدد کرنے اور ملک کی سرحدوں کی حفاظت اور بیرونی حملوں کی مدافعت کرنے اور اندرونی امن واتحاد کی برقراری کے لئے رضا کار تنظیم کو نیم فوجی بنیادوں پر مستحکم کرنا شروع کیا، حیدرآباد کا کوئی مسلم نوجوان ایسا نہ تھا جو اس حب الوطن تحریک میں شریک میں نہ ہو، بچے اور پردہ نشین خواتین تک سب ہی اس تنظیم سے وابستہ تھے۔ غرض حکومت ہند نے حیدرآباد کی آزادی یا ہند یونین میں شرکت کے فیصلہ کے لئے اپنی نئی پیش کردہ استصواب عامہ کی شرط سے انحراف کیا تھا ہے، رضا کار ڈسپلن کے پابند تھے، جب تخریب کاروں کی شرانگیزی حد سے بڑھ جاتی اور حیدرآباد کے علاقوں پر ہند کی سرحدوں سے مسلح افواج کے حملے کئے جاتے تو رضا کار دستے ان کی سرکوبی اور مدافعت کا فرض تن دہی سے انجام دیتے۔ گویا دکن کی حفاظت ان کا اولین مشن تھا"۔ (سقوط حیدرآباد اور پولیس ایکشن)

اس اجمالی تعارف سے پتہ چلا کہ رضا کار تنظیم کن عوامل واسباب کے پیش نظر وجود میں آئی اور اس کے بنیادی اہداف ومقاصد کیا تھے؛ لیکن ان میں کچھ لوگ ذاتی مفادات کے لیے فسادات بھی کیے، اس پر مستزاد بعض شر پسند ہندو رضا کاروں کی وردی اور لباس زیب تن کر کے مہاراشٹر اور دیگر علاقوں میں چوری، دنگا اور لوٹ مار کیا کرتے تھے، جو در پردہ اس تحریک کو بدنام کرنے اور لوگوں کو اس سے متنفر کرنے کی ایک مذموم سازش تھی،

یہ رضا کار قوم کی اختصاراً اسرگزشت ہے، مگر جو فلم اس نام سے منظر عام پر آنے والی ہے اس میں حقیقت کو سرے سے بدل کر دن کو رات بنا کر دکھایا جانے والا ہے، اور جھوٹ کو بڑی ملمع سازی کے ساتھ سچ بتانے اور دکن کے مسلمانوں کو حیدر آبادی ہندوؤں کے حق میں ظالم وقاہر دکھانے کی کوشش ہے، فلم کا جو ڈیڑھ منٹ کا ٹیزر ریلیز ہوا اس میں یہ بتایا گیا کہ رضا کار قوم سے وابستہ مسلمانوں نے مندروں کو منہدم کیا ہے، ہندو پجاریوں پر جور و جبر کر کے ان کے مذہبی تشخصات کی پامالی کی ہے، ہندو عورتوں اور بچوں کے ساتھ ناروا سلوک اور مار پیٹ کی ہے، ہندوؤں کے املاک کو لوٹا اور نظام دکن کے حکم پر جبراً ان کو اسلام لانے پر مجبور کیا اور انکار کرنے والوں کو زدوکوب کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، یہ تو اس ڈیڑھ منٹ کی ویڈیو کلپ سے مقتبس تجزیہ ہے، باقی فلم کن من گھڑت واقعات پر مبنی ہے یہ تو اس کے ریلیز کے بعد ہی پتہ چلے گا، (خدا کرے کہ ریلیز ہی نہ ہو)

ظاہری بات ہے کہ ہر شخص فطری طور پر اپنے مذہب کے تعلق سے نہایت حساس اور جذباتی واقع ہوا ہے، جب وہ اس طرح کے پروپیگنڈے پر مبنی فلم کا بہ چشمِ خود مشاہدہ کرے گا تو لا محالہ مسلمانوں کے تعلق سے زہریلا اثر اس کے رگوں میں جوش مارنے لگے گا، اور الفت کی جگہ نفرت اس کے دل میں افتاد ہوگی، اور معاشرتی امور سے لے کر معاملات تک اور اعیاد و تقاریب کے مواقع ہوں یا کچھ اور ہر جگہ وہ مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک اختیار کرے گا، اور کسی نہ کسی درجے میں اس کے ذہن پر یہ فکر سوار ہوگی کہ یہاں ریاست میں ایسی پارٹی کی حکومت قائم ہونی چاہیے جو ان کے جان و مال کے ساتھ مذہبی اقدار کی محافظ اور ہندوازم کے شیوع میں معاون ثابت ہو، اور جس طرح مسلمانوں نے ماضی میں ان کی قوم اور مذہب پر ظلم ڈھایا ہے (اس کے اپنے گمان کے مطابق) اس طرح ان کے ساتھ بھی انتقامی کاروائی کی جائے، اور ان کے مذہبیات و ملی تشخصات پر پابندیاں عائد کر کے اسلام کی ترقی کو مسدود کر دیا جائے، بہر کیف یہ فلم الیکشن سے پیشتر مسلمانوں کے بابت ہندوؤں کے جذبات کو مشتعل کرنے کا ایک ایجنڈا ہے، اب اس فلم کے ریلیز ہونے سے قبل مسلم عوام وخواص کی ذمہ داری کیا ہے؟ ملاحظہ فرمائیں کہ! اولاً تو اپنے قوم کے تابناک ماضی اور شاہکار کردار سے ہم خود واقف ہو جائیں، غلط خیالات میں مبتلا ہونے کے بجائے حق کے سانچے میں اپنے افکار کو ڈھالیں، نیز علماء کرام بھی اپنی تقریروں، تحریروں اور ہر عوامی پلیٹ فارم پر لوگوں کی صحیح تاریخ کی جانب راہنمائی کریں، اور ان کو اس سے واقف کرائیں، اور اس طرح کے باطل ایجنڈوں سے پیشگی اپنی قوم کو آگاہ کر دیں اور ارباب اقتدار و صاحبِ منصب مسلمان سیکولر ذہنیت والے غیر مسلم لیڈران کی معیت و معاونت میں اس طرح کے فلموں پر امتناع عائد کرنے اور اس کے ریلیز کو روکنے کی مقدور بھر کوشش کریں۔ ـــــــ (بقیہ صفحہ: ۱۵ پر)

فکر و نظر

یکساں سول کوڈ: ہے تاک میں دزدیدہ نظر دیکھیے کیا ہو؟

از: مولانا سید آصف ندوی*

حالیہ دنوں وطن عزیز بھارت کی صورت حال یہ ہے کہ ملک کے مختلف گوشوں سے ایک مرتبہ پھر سے یونیفارم سول کوڈ کے نفاذ کا نعرہ بلند کیا جارہا ہے، حالانکہ یہ نعرہ کوئی نیا نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت نئی بوتل میں پرانی شراب سے زیادہ کی نہیں ہے؛ تاہم یہ ایک انتہائی حسّاس مسئلہ ہے، ہر چند سالوں بعد ان وطن دشمن فرقہ پرست عناصر کے پیٹ میں مروڑ شروع ہوجاتا ہے، اور وہ اس ادھیڑ بن میں لگ جاتے ہیں کہ کس طرح اس ملک کی اقلیتوں اور بالخصوص مسلمانوں کو ان کے جائز انسانی اور قانونی حقوق سے بھی محروم کردیا جائے، وطن عزیز بھارت کا یہ زعفرانی ٹولہ مسلمانوں کے خلاف ہمہ وقت آتش حسد میں جلتا رہتا ہے، مسلمانوں کی جانیں، جائیدادیں، ان کے تعلیمی ادارے، ثقافتی مراکز، دینی مدارس سب ہی ان کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح چبھتے رہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اکثر و بیشتر یہ افراد مسلمانوں کی جانوں، جائیدادوں، تعلیمی اداروں، دینی مدارس وغیرہ پر کسی نہ کسی بہانے سے حملے کرواکر انہیں زک پہنچانے کا کام کرتے ہی رہتے ہیں۔

آج اگر ہمارا یہ پیارا ملک بھارت دنیا کے نقشہ پر ایک عظیم سیکولر و جمہوری ملک کی حیثیت سے اپنی ایک منفرد شناخت اور پہچان رکھتا ہے تو اس کی واحد وجہ یہی ہے کہ اس ملک کو انگریز غاصبوں کے چنگل سے آزاد کرانے کے لئے مختلف دین و مذہب، تہذیب وتمدن، زبان وثقافت اور رنگ ونسل کے جیالوں نے محض اس امید پر اپنا خون جگر دیا تھا کہ یہ ملک ہمیشہ جمہوری وسیکولر ملک رہے گا، اور آزادی کے بعد اس ملک کے ہر طبقے اور فرقے کو اس کے اپنے دین و مذہب، تہذیب وتمدن، زبان وثقافت اور خاندانی ونسلی ٹریڈیشنس ورسومات کے ساتھ زندگی گذارنے کی مکمل آزادی حاصل ہوگی۔

مسلمانوں اور بالخصوص ان کے علماء کرام نے سب سے زیادہ اور سب سے آگے بڑھ کر اپنی جانوں کی قربانیاں محض اسی وجہ ہی سے پیش کی تھی کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ آزادی کے بعد ملک اگر سیکولر و جمہوری ہوگا

* صدر جمعیت علماء، شہر ناندیڑ

تومسلمانوں کو اپنے دین ومذہب پر اور اپنے عائلی معاملات پر شریعت اسلامیہ کے قوانین کے مطابق عمل کرنے کی مکمل آزادی حاصل ہوگی۔اس بات کی اہمیت ان مسلم مجاہدین آزادی کے نزدیک اس قدر زیادہ تھی کہ انہوں نے ملک کی آزادی سے پہلے ہی سے ارباب اقتدار کی جانب سے مسلم پرسنل لاء کی ضمانت وحفاظت کی یقین دہانی کرانی شروع کردی تھی ، ان کی وہ کوششیں ہی تھیں جن کے نتیجے میں گاندھی جی نے ۱۹۳۱ء میں لندن میں منعقدہ گول میز کانفرنس میں دوٹوک انداز میں کہا تھا کہ ''مسلم پرسنل لاء'' کو کسی بھی قانون کے ذریعے چھیڑا نہیں جائیگا'' اور پھر آزادی سے تقریباً دس سال پہلے ۱۹۳۷ء میں Shariat Application Act 1937 (قانون تحفظ مسلم شریعت) پاس کیا گیا اور بعد میں اس کو آئینِ ہند کا حصہ بھی بنادیا گیا۔

جمعیت علماء ہند (تحریک آزادیٔ ہند میں جس کا کردار سب سے زیادہ اہم رہا ہے) نے اپنی مجلس عاملہ منعقدہ ۱۸، ۱۷/اگست ۱۹۴۲ کے اجلاس میں دین و مذہب کے متعلق مسلمانوں کے اسی نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتے ہوئے واضح الفاظ میں یہ تجویز منظور کی تھی کہ ''اس موقعے پر ہم یہ بھی واضح کردینا ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر جمعیت علماء کو اس امر کا ذرہ بھر بھی وہم ہوتا ہے کہ جدوجہد آزادی کا نتیجہ ہندوستان میں ہندوراج قائم ہوجانا ہے تو وہ ایک لمحہ توقف کئے بغیر اس کی شدید مخالفت کرتی''۔''ہم آزاد ہندوستان سے وہ آزاد ہندوستان مراد لیتے ہیں جس میں مسلمانوں کا مذہب ، ان کی اسلامی تہذیب اور قومی خصوصیات آزاد ہوں۔۔۔مسلمان جو انگریز کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کے لئے بیش بہا اور شاندار قربانیاں پیش کریں گے ان کی نسبت ہندو کی غلامی قبول کرنے کا تصور بھی ان کی سخت توہین ہے۔'' (جمعیت علماء کیا ہے؟ صفحہ: ۲۴۳/ ۲۴۴)۔

عائلی قوانین اور مذہبی تعلیمات واحکامات سے متعلق مسلمانوں کا موقف روز اول سے واضح ہے کہ دین اسلام مکمل ضابطۂ حیات ولائحۂ عمل ہے، اس کے تمام ضابطے اور قوانین خود خالق کائنات کے بنائے ہوئے ہیں۔کسی بڑے سے بڑے اسکالر وعالم دین حتیٰ کہ وقت کے نبی کو بھی اس کا حق نہیں ہے کہ وہ ان قوانین میں کوئی تبدیلی کرسکے یا مسلمانوں کے لئے خالق کائنات کے وضع کردہ قوانین سے ہٹ کر کوئی قانون اور ضابطۂ حیات نافذ کرسکے۔اسلام نام ہی اللہ کی حکمرانی کو تسلیم کرنے کا ہے، اگر کوئی مسلمان اللہ تعالیٰ کے وضع کردہ قوانین سے ہٹ کر انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین یا یکساں سول کوڈ کو تسلیم کرتا ہے تو ایسی صورت میں اس کے ایمان پر سوالیہ نشان قائم ہوجاتا ہے۔

تعاقب فرقِ ضالہ

قادیانی فرقہ کیوں مسلمان نہیں؟؟

عقل وانصاف کی عدالت میں!!

از: مولانا محمد انصار اللہ قاسمی*

گذشتہ دنوں آندھرا پردیش وقف بورڈ کو مرکزی وزراتِ اقلیتی بہبود کی طرف سے جاری کردہ ایک نوٹس اور خود مرکزی وزیر اقلیتی بہبود سمرتی ایرانی صاحبہ کا ویڈیو بیان ذرائع ابلاغ میں بہت زیادہ زیر بحث رہا، اس نوٹس اور بیان میں خود کو ''احمدیہ کمیونٹی'' کہنے والے قادیانی فرقہ کے غیر مسلم ہونے سے متعلق فتوی پر سوال کھڑا کیا گیا، وقف بورڈ مسلمانوں کے مسائل اور معاملات کو حل کرنے اور اُن کی فلاح و بہبودی کے اقدامات روبہ عمل لانے کے لئے خود حکومت کا قائم کردہ سرکاری ادارہ ہے، اپنے دائرہ کار اور دائرہ اختیار کے حوالہ سے وقف بورڈ کی بھی اپنی ایک قانونی ودستوری حیثیت ہوتی ہے، جیسے اقلیتی اداروں میں اگر کوئی غیر اقلیتی شخص داخلہ لینا چاہے تو متعلقہ محکمہ اُس پر روک لگاتا ہے، تو ایسے اگر کوئی غیر مسلم مسلمانوں کے لئے مختص معاملات اور منصوبوں سے استفادہ کرنا چاہے تو وقف بورڈ اُس کو مسترد کرسکتا ہے، وقف بورڈ نے بذات خود قادیانی فرقہ کے غیر مسلم ہونے کا فیصلہ نہیں کیا ہے، اُس نے تو صرف اس بابت تمام مسلمانوں کے متفقہ فیصلہ کو پیش کیا ہے۔

اگر نوٹس کا مواد صرف وقف بورڈ کے اس اقدام کی قانونی حیثیت پر سوال کھڑا کرنے کی حد تک محدود ہوتا تو بھی کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا، لیکن اس سے آگے بڑھ کر ''احمدیہ کمیونٹی'' کے بارے میں علماء اسلام اور مذہبی اسکالرس کے جاری کردہ متفقہ فتویٰ کو چیالنج کیا گیا اور کہا گیا کہ وقف بورڈ کی قرارداد ''احمدیہ برادری کے خلاف بڑے پیمانہ پر ایک نفرت انگیز مہم قرار پاتی ہے.....'' (دیکھیئے! روزنامہ منصف حیدرآباد مورخہ ۲۳/ جولائی ۲۰۲۳ء) مسلمانوں کا قادیانی فرقہ کے بارے میں مسلمان نہ ہونے کا متفقہ موقف، کیا واقعتاً نفرت انگیز مہم اور عدم رواداری پر مبنی ہے؟؟ اس سلسلہ میں چند ضروری وضاحتیں پیش خدمت ہیں، جن پر غیر جانبدارانہ، منصفانہ اور مخلصانہ انداز میں غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے:

---

* آرگنائزر مجلس تحفظ ختم نبوت ٹرسٹ تلنگانہ وآندھرا، استاذ المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد

لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا!!

دنیا میں لوگ اپنی نسبتوں سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں ،اپنے ملک اور علاقہ کی نسبت سے کوئی ہندوستانی یاامریکی ہوتا ہے،کوئی اپنی تعلیم اور پروفیشنل کی نسبت سے ڈاکٹر،انجینئر یاوکیل ہوتا ہے کوئی اپنے کام اور پیشہ کی نسبت سے تاجر، کسان،مزدور کہلاتا ہے،غور کرنا چاہئے لوگ خواہ مخواہ اور زبردستی ان نسبتوں کے ساتھ جڑے نہیں رہتے بلکہ جب تک وہ ان نسبتوں کے اصول اور تقاضوں کی پابندی اور پاسداری کرتے رہیں گے ،ان نسبتوں سے ان کا جڑے رہنا صحیح ہوگا،مثلاً ہندوستانی اور امریکی ہونے کے لئے ان ملکوں کا پابند قانون شہری ہونا ضروری ہوگا،اگر شہریت ہی نہ ہوتی وہ خود کو امریکی یا ہندوستانی نہیں کہہ سکتا،اسی طرح ڈاکٹر اور وکیل بننے کے لئے متعلقہ علوم کی ڈگری ہونا ضروری ہے۔

ایسا ہی کچھ معاملہ مختلف مذاہب کی نسبت سے اپنے کو جوڑنا اور جوڑے رکھنا بھی ہے،اپنے اپنے مذہبی عقائد اصول اور ضابطوں کی پیروی اور پابندی کی وجہ سے کوئی ہندو،کوئی سکھ،کوئی یہودی،کوئی عیسائی وغیرہ ہوتا ہے،ایسا نہیں ہوسکتا کہ کوئی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا انکار کرے پھر بھی وہ یہودی کہلائے،کوئی عقیدہ تثلیث،عقیدہ کفارہ اور بتسمہ وغیرہ کو نہ مانے پھر بھی وہ عیسائی کہلائے۔

اس پس منظر میں قادیانی فرقہ کے کیس کو سمجھنے کی ضرورت ہے،اس فرقہ کے لوگ دین اسلام سے اپنی نسبت جوڑنے پر اصرار کرتے ہیں،ان کو ضد ہے کہ انھیں مسلمان کہا جائے اور ملتِ اسلامیہ کا حصہ مانا جائے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اسلام سے اپنی نسبت جوڑنے اور خود کو مسلمان کہلانے کا معاملہ اتنا آزادانہ اور غیر مشروط ہے کہ اس میں کوئی ضابطہ اور اصول ہی نہ ہو؟ کیا یہ معاملہ عام دنیاوی معاملات سے بھی گیا گذرا ہے کہ اس میں قاعدہ وقانون کی کوئی بات ہی نہ ہو؟ ؟ یہ کوئی گیند اور فٹ بال تو نہیں ہے کہ جدھر بھی گھماؤ اور جس زاویہ سے بھی دیکھو گیند اور فٹ بال ہی نظر آئے،آدمی چاہے جو بھی عقیدہ رکھے اور وہ جس نظریہ کا بھی حامی اور داعی ہو،جس پہلو سے بھی اسے دیکھا جائے تو وہ مسلمان نظر آنے لگے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام سے نسبت جوڑنہ اتنا آسان اور سستا سودا نہیں ہے،”لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا“ عام دنیاوی معاملات میں اور دیگر مذاہب کے مقابلہ میں نسبت جوڑنے کے حوالہ سے اسلام کا معاملہ کئی گنا سخت ہے،مسلمان ہونے کے لئے اسلام کے بنیادی اصولوں (عقائد) کو تسلیم کرنا ضروری ہے، توحید،رسالت آخرت کو مانے بغیر کوئی خود کو مسلمان نہیں کہہ سکتا،قادیانی فرقہ عقیدہ رسالت کے ضمن میں اسلام کے بنیادی عقیدہ ”عقیدہ ختم نبوت“ کا منکر ہے،اس لئے یہ فرقہ اسلام سے اپنی نسبت نہیں جوڑ سکتا اور نہ وہ ملت

اسلامیہ کا حصہ ہوسکتا ہے، کیوں کہ اسلام میں داخل ہونے کے لئے حضرت محمد ﷺ کو نبی ماننے کے ساتھ آخری نبی تسلیم کرنا اتنا ہی اہم اور ضروری ہے جتنا کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کرنا۔

دوسرے یہ کہ اسلام میں داخل ہونے کے لئے تو اس کے تمام بنیادی اصولوں کو ماننا ضروری ہے لیکن اسلام سے باہر ہونے کے لئے تمام بنیادی اصولوں کا انکار کرنا ضروری نہیں بل کہ کسی ایک اصول کے انکار سے بھی آدمی دائرہ اسلام سے خارج ہوجاتا ہے، اس لئے یہاں اس بات کا حوالہ دینا بے معنی اور بے مقصد ہے کہ قادیانی اسلام کے بعض اصولوں پر ایمان رکھتے ہیں۔

بہرحال جس طرح ہندوستانی یا امریکی کہلانے کے لئے وہاں کے ''قانون شہریت'' کا پابند ہونا ضروری ہے، اسی طرح خود کو مسلمان کہنے اور کہلانے کے لئے اسلام کے قانون شریعت کو تسلیم کرنا ضروری ہے۔

نبی بدل جانے سے شناخت بھی تبدیل ہوجاتی ہے:

قادیانی فرقہ کو غیر مسلم قرار دینے کا فتویٰ عقل وانصاف کے موافق ہے، اس لئے کہ دنیا میں مختلف مذہبی برادریوں کی شناخت وپہچان ان کے نبیوں اور ریفارمرس سے ہوتی ہے، چنانچہ جو لوگ حضرت عیسیٰؑ کی دعوت پر ایمان لائے انھیں ''عیسائی'' کہتے ہیں، جنھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کو قبول کیا وہ ''یہودی'' کہلاتے ہیں، جو لوگ گوتم بدھ کو اپنا رہنما مانتے ہیں وہ ''بدھسٹ'' کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں اور جو لوگ گرونانک کی تعلیمات پر یقین رکھتے ہیں وہ ''سکھ'' کہلاتے ہیں، حضرت رسول کریم ﷺ پر ایمان لانے والوں کو ''مسلمان'' کہتے ہیں۔

پس جیسے دوسرے لوگ اپنے الگ الگ نبیوں اور ریفارمرس کو ماننے کی بنا مختلف ناموں سے اپنی الگ شناخت وپہچان رکھتے ہیں اسی طرح مرزا قادیانی کو نبی ماننے کی وجہ سے قادیانیوں کی مذہبی شناخت بالکل الگ ہوگی، اپنی اس الگ شناخت کی بنیاد پر وہ خود کو ''قادیانی اور مرزائی'' تو کہہ سکتے ہیں لیکن ''مسلمان'' نہیں کہہ سکتے، کیوں کہ مسلمان حضرت محمد ﷺ کی نبوت ورسالت پر ایمان رکھنے والوں کو کہتے ہیں نہ کہ مرزا قادیانی کے دعویٰ نبوت قبول کرنے والوں کو۔

دوسرے یہ کہ اگر کوئی آدمی پہلے سے کسی نبی اور پیغمبر کو مان رہا تھا پھر اس کے ساتھ ساتھ وہ بعد میں آنے والے نبی کو بھی ماننے لگے تو پہلے نبی کو ماننے کی وجہ سے اس شخص کی جو شناخت بنی تھی وہ ختم ہوجائے گی اور بعد میں آنے والے نبی کی نسبت سے اُس کی پہچان ہوگی، مثلاً یہودی حضرت موسیٰؑ کو نبی مانتے ہیں، لیکن یہودی قوم میں سے اگر کوئی حضرت موسیٰؑ کے بعد آنے والے نبی حضرت عیسیٰؑ کو مانتا ہے تو اب وہ یہودی باقی نہیں

رہے،گا بلکہ عیسائی ہو جائے گا،حالاں کہ اس نے حضرت موسیٰؑ کی نبوت کا انکار نہیں کیا لیکن اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو یہودی نہیں کہلا سکتا اور نہ ہی یہودی کمیونٹی اُس کو یہودی کہلانے کی اجازت دے گی،اسی طرح عیسائی ہیں،ان میں اگر کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نبوت ورسالت کا اقرار کرتا ہے تو وہ عیسائی باقی نہ رہے گا ''مسلم'' کہلائے گا،اب مسلم ہونے کا مطلب یہ کہ وہ حضرت موسیٰؑ کو بھی مانتا ہے اور حضرت عیسیٰؑ پر بھی ایمان رکھتا ہے،اب اس بنیاد پر خدانخواستہ ہزار بار خدانخواستہ کوئی مسلمان یہودی یا عیسائی شناخت پر اپنا دعویٰ پیش کرے اور مطالبہ کرنے لگے کہ میں اگرچہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر ایمان رکھتا ہوں لیکن اس کے باوجود مجھے عیسائی یا یہودی کہنے دیا جائے، کیوں بحیثیت مسلمان حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نہ صرف نبی مانتا ہوں بلکہ اسلام پر باقی رہنے کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سچا نبی تسلیم کرنا ضروری ہے،لیکن اس سب کے باوجود عام ضابطہ کے مطابق نہ مسلمان کے اس دعوے کو قبول کیا جائے گا اور نہ یہودی وعیسائی برادری اُس کو یہودی وعیسائی کہنے کی اجازت دیں گے،اس لئے کہ جب تک وہ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت موسیٰؑ کو نبی مانتا تھا تو وہ عیسائی اور یہودی تھا لیکن جب وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر ایمان لایا تو اس کے نئے نبی کو ماننے کی وجہ سے وہ یہودی اور عیسائی مذہب سے خارج اور الگ ہو گیا،حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر ایمان رکھنے کے ساتھ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ پر ایمان رکھنا اس کے لئے عیسائی اور یہودی شناخت اپنانے اور اختیار کرنے کو جائز نہیں ٹھہراتا۔

بالکل یہی معاملہ خود کو ''احمدی مسلمان'' کہنے والے قادیانی فرقہ کے پیروکاروں کا ہے، یہ اگرچہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں، قطع نظر اس کے کہ ان کا دعویٰ کہاں تک صحیح اور سچا ہے؟ یہ لوگ اپنے اس دعوے کی بنیاد پر اپنے لئے مسلم شناخت کا اصرار نہیں کر سکتے، کیوں کہ یہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد ایک اور مدعی نبوت مرزا غلام قادیانی کو بھی مانتے ہیں اس کی وجہ سے مسلم کی حیثیت سے ان کی سابقہ شناخت ختم ہو گئی، پس جیسے کوئی عیسائی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو نبی ماننے کے بعد عیسائی باقی نہیں رہتا، ایسے ہی کوئی مسلمان مرزا غلام قادیانی کو نبی ماننے کے بعد مسلمان باقی نہیں رہتا، جیسے عیسائی شناخت پر نہ مسلمان کے دعوے کو قبول کیا جاتا ہے اور نہ ہی عیسائی برادری اُس کی اجازت دیتی ہے، ایسے ہی مسلم شناخت پر قادیانی فرقہ کے دعوے کو نہ قبول کیا جائے گا اور نہ مسلمان اس کی اجازت دیں گے،غرض یہ کہ اس عام ضابطہ کی روشنی میں یہ بات واضح ہو گئی کہ نبیوں کے بدلنے سے مذہبی شناخت بھی تبدیل ہو جاتی ہے،قادیانی فرقہ کا نبی چوں کہ تبدیل ہو گیا اس لئے اب یہ فرقہ بحیثیت مسلمان اپنی شناخت کا اظہار نہیں کر سکتا۔

فقہ وفتاویٰ

آپ کے شرعی مسائل

از: مفتی محمد ندیم الدین قاسمی*

کیاانجکشن لگانے سے وضوٹوٹ جائے گا؟

سوال: کیاانجکشن لگانے سے وضوٹوٹ جائے گا؟

جواب: انجکشن لگانے سے وضونہیں ٹوٹے گا؛ مگر یہ کہ اس کی وجہ سے خون نکل کر ایسی جگہ کی طرف بہے، جس کا وضواور غسل میں دھونا واجب ہے، تو وضوٹوٹ جائے گا۔(محقق ومدلل جدید مسائل،۱/۱۰۸)

فلٹر کیا ہوا پیشاب

سوال: اگر پیشاب کوفلٹر کرلیا جائے تو کیاوہ پاک ہوجائے گا؟

جواب: پیشاب نجس ہے، کیوں کہ فلٹر کرنے سے محض اس کی بدبوزائل ہوتی ہے، حقیقت تبدیل نہیں ہوتی ،لہٰذااس سے انتفاع جائز نہیں ہے۔(محقق ومدلل جدید مسائل،۱/۱۱۲)

قرآن مجید کا ترجمہ وتفسیر اور کتب حدیث وفقہ کا بلا وضو چھونا

سوال: کیا قرآن مجید کا ترجمہ وتفسیر اور حدیث وفقہ کی کتابوں کو بلا وضو چھونا جائز ہے؟

جواب: قرآن مجید کا ترجمہ وتفسیر؛ خواہ اردو، فارسی اور انگریزی، کسی بھی زبان میں ہو، اُن کو اور اسی طرح کتب حدیث وفقہ کو بلا وضو چھونا مکروہ ہے۔(محقق ومدلل جدید مسائل،۱/۱۲۳)

آیات سجدہ ٹائپ یا کمپوز کرنے سے سجدۂ تلاوت

سوال: آیات سجدہ ٹائپ کرنے والے یا کمپوزنگ کرنے والے پر سجدۂ تلاوت واجب ہوگا یا نہیں؟

جواب: آیات سجدہ ٹائپ کرنے والے یا کمپوزنگ کرنے والے پر سجدۂ تلاوت واجب نہیں ہوگا، مگر یہ کہ وہ آیت سجدہ زبان سے پڑھے تو اس صورت میں سجدۂ تلاوت لازم ہوگا۔(محقق مدلل جدید مسائل،۱/۱۳۶)

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

ڈوب کر مرجانے والے کو غسل دینا

سوال: اگر کوئی شخص پانی میں ڈوب کر مرجائے اور بعد میں اس کی لاش دستیاب ہوتو کیا اسے بھی عام مردوں کی طرح غسل دیا جائے گا؟

جواب: اگر کوئی شخص پانی میں ڈوب کر مرجائے اور بعد میں اس کی لاش دستیاب ہوتو اسے بھی عام مردوں کی طرح غسل دیا جائے گا، یعنی پانی میں مرجانا اس کے غسل کی طرف سے کافی نہیں ہوگا، البتہ اگر لاش کو پانی سے نکالنے سے پہلے، غسل کی نیت سے متعدد مرتبہ حرکت دے دی جائے، تو یہ غسل شرعا معتبر ہے۔

(کتاب المسائل، ۲/ ۶۴)

جنازہ دیکھ کر کھڑا ہونا

سوال: جنازہ دیکھ کر کھڑا ہونا کیا مستحب ہے؟

جواب: جو لوگ کہیں بیٹھے ہوئے ہوں، اوران کا ارادہ جنازے کے ساتھ جانے کا نہ ہوتو انہیں جنازہ دیکھ کر کھڑا نہیں ہونا چاہیے، یہ حکم پہلے تھا، اب منسوخ ہوگیا۔ (کتاب المسائل، ۲/ ۷۲)

نیوتہ کا حکم

سوال: ولیمہ یا بیٹی کی رخصتی میں جو نقد رقم لفافے کی شکل میں دی جاتی ہے اُس کا لینا شرعاً کیسا ہے؟

جواب: اگر معاشرے کے رسم ورواج اور بے عزتی کے خطرے یا اِس نیت سے کہ ہم نے رقم دی ہے کل ہمیں بھی رقم واپس ملے گی، تو اس طرح اگر یہ رقومات دی جاتی ہیں تو لین دین جائز نہیں، کیوں کہ دلی رضامندی نہیں پائی جارہی ہے اور اگر آدمی اِن چیزوں سے قطع نظر اپنی وسعت کے اعتبار سے جس کی تقریب ہورہی ہے اُس سے تعلق کے اظہار کی خاطر بلا کسی جبر کے ہدیہ پیش کرتا ہے تو اِس کی گنجائش ہے؛ لیکن اَدل بدل کی جو بات ہے اُس سے بہرحال احتراز کرنا چاہیے، اور کسی کے ساتھ جبر اور زبردستی کا معاملہ نہ صراحتاً ہونا چاہیے نہ دلالۃً۔

(مشکوٰۃ المصابیح باب الغصب والعاریۃ، بہ حوالہ ارشاد السائلین: ۲/ ۳۰۰)

نکاح میں لڑکی کے غلط نام پر ایجاب وقبول کا حکم

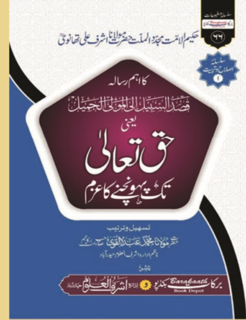
سوال: نکاح خواں صاحب نے لڑکی کا نام رجسٹر میں غلط لکھ دیا اور ایجاب کراتے وقت وہی غلط نام لے کر نکاح پڑھایا اور اُسی پر لڑکے نے قبول کیا، تو نکاح ہوا یا نہیں ہوا؟

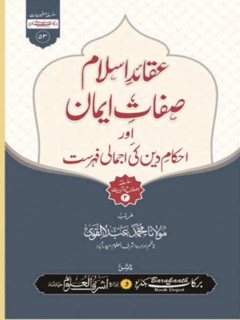
جواب: مسئولہ صورت میں نکاح درست نہیں ہوا کیوں کہ لڑکی کا نام غلط لیا گیا؛ لہذا پہلی فرصت میں تجدید نکاح کرادیا جائے۔ (البحر الرائق: کتاب النکاح: ۳/ ۱۵۰، بہ حوالہ ارشاد السائلین: ۲/ ۲۸۹)

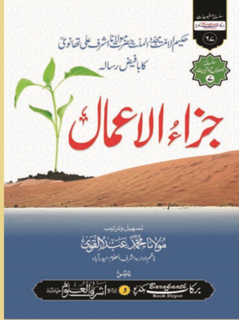
ASHRAFUL JARAID MONTHLY Rs20/-

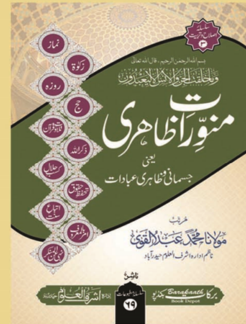
RNI No: APURD/2007/24089 Postal. No: HSE/884/23-25

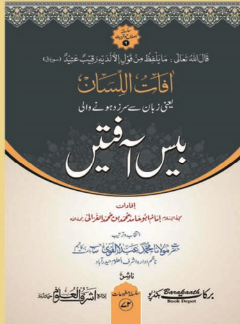
Date of Publication 3rd Oct-23, date of Posting 5th Oct-23



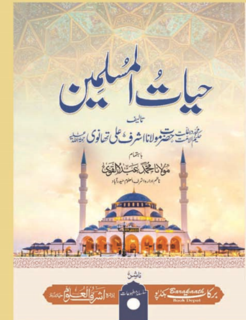


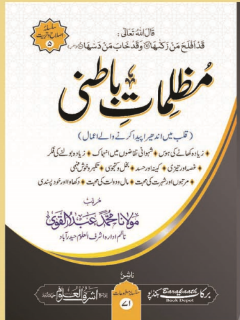


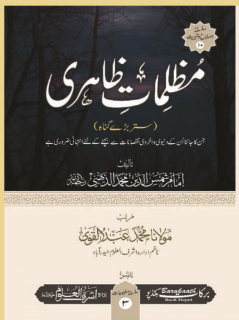












Printer, Publisher & Owner: Mohd Abdul Qavi, # 17-1-391/2, Khaja Bagh, Sayeedabad Colony, Hyderabad- 500059

Published from: # 17-1-391/2, Khaja Bagh, Sayeedabad Colony, Hyderabad- 500059

Editor : Mohammed Abdul Qavi. Printed at: Aish Offset Printers, Cellar Masjid-e-Meraj, Sayeedabad, Hyd-59